تلمیحاتِ غالب

(مع ترمیم واضافہ)

مؤلفہ

محمود نیازی

غالب اکیڈمی
حضرت نظام الدین، نئی دہلی

ک

غالب اکیڈمی، نئی دہلی

اشاعت اول	:	جون ۱۹۷۲ء
اشاعت دوم	:	۲۰۰۲ء
کمپوزنگ	:	ذہین کمپیوٹر، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی
ناشر	:	غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی
قیمت	:	پچھتر روپے
مطبع	:	پرنٹنگ سروس کارپوریشن، نئی دہلی

Talmeehat-e-Ghalib by Mehmood Niyazi

Rs. 75/=

پیش لفظ

جناب محمود نیازی مرحوم کی کتاب 'تلمیحات کلام غالب' ۱۹۷۲ء میں پہلی دفعہ چھپی۔ پسند کی گئی اور ختم ہو گئی۔ اس کے بعد عرصے تک ناپید رہی، مگر اس دوران مرحوم اس پر نظر ثانی فرماتے رہے۔ تلمیحات کی تلاش، ان کی توضیح و تشریح، نیز ضروری تحقیق کی افادیت سب کے سامنے ہے۔ افسوس ہے کہ نیازی صاحب بہت جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور ان کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ان کے سامنے نہ چھپ سکا۔ تاہم مرحوم کے فرزند جناب عارف حسین نیازی نے ازراہ کرم اپنے والد کے قلم سے ترمیم کردہ اور نظر ثانی شدہ اصل مسودہ غالب اکیڈمی کو مرحمت فرمادیا، جسے ان کے شکریے کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ نئے ایڈیشن کی افادیت پرانے ایڈیشن سے زیادہ ہے۔ امید ہے اس کی پذیرائی بھی پہلے سے زیادہ ہوگی، اور غالبؔ کے قدر دان اسے پہلے ایڈیشن کی طرح کارآمد نیز مفید تر پائیں گے۔

(خواجہ) حسن ثانی نظامی

(صدر)

غالب اکیڈمی

تعارف

از

حضرت مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رامپوری

دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں قصہ طلب الفاظ بولے یا لکھے نہ جاتے ہوں۔ اہل عرب نے مذکورۂ بالا قسم کے الفاظ استعمال کرنے کو ادبی ہنر قرار دیا ہے، اور اس کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے لغوی معنی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہیں اور فنی مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اختصار کے ساتھ حسن یا زور پیدا کرنے کے لیے کسی قصے، شعر یا کہاوت کی طرف اشارہ کیا جائے، مثلاً عربی کا شعر ہے:

فواللہ، ما ادری أ احلام نائم

المت بنا، ام کان فی الرکب یوشح

اس شعر سے پہلے شاعر نے کہا ہے کہ میں اپنے مسافر دوستوں سے جاملا اور رات کے اندھیرے میں محبوبہ کا چہرہ سورج کی طرح میری آنکھوں میں جگمگا اٹھا۔ مگر قسمت کی اس یاوری پر شاعر کو یقین نہیں آتا، اور وہ اس حیرت و استعجاب کو ظاہر کرنے کے لیے آخر میں کہتا ہے کہ "بخدا، میں نہیں جانتا کہ یہ خوابِ پریشاں تھا، جو میں نے دیکھا، یا کاروان میں یوشع موجود تھے۔" اس شعر میں یوشع تلمیح ہے، اور اس میں ردِ شمس کے قصے کی طرف اشارہ ہے جو خداوند عالم نے سنیچر کی شام حضرت یوشع کی دعا پر لوٹا دیا تھا تاکہ وہ جہاد کی تکمیل

کر سکیں، ورنہ اتوار شروع ہو جانے پر جنگ نہیں کی جا سکتی تھی۔

دیکھیے اس شعر میں لفظ یوشع نے ایک طویل قصے کو دہرانے سے بچالیا، ایک اور عربی شعر ہے:

لعمر و مع الرمضاء و النار تلتظی
ارق و احفی منك فی ساعة الکرب

یعنی عمرو تپتی زمین اور بھڑکتی آگ میں ہوتے ہوئے بھی دکھ کی گھڑی میں تجھ سے زیادہ نرم دل اور شفیق ثابت ہوگا۔ اس شعر میں شاعر نے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ کیا ہے، جو یہ ہے:

المستجیر بعمرو عند کربته
کالمستجیر من الرمضاء بالنار

یعنی جو کوئی اپنی مصیبت میں عمرو سے پناہ طلب کرے، وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص تپتی زمین سے بچنے کے لیے آگ سے پناہ مانگے۔

یہ آخری شعر بھی قصہ طلب ہے۔ جساس بن مرہ اور عمرو بن حارث دونوں آگے پیچھے کلیب کو قتل کرنے نکلے۔ جساس نے کلیب کو جالیا اور اسے تیر مار کر زخمی کر دیا۔ کلیب نے زمین پر تڑپتے ہوئے جساس سے پانی مانگا۔ جساس نے پانی نہ دیا اور چھوڑ کر چل دیا۔ اتنے میں عمرو آگیا۔ کلیب نے اس سے بھی پانی مانگا۔ عمرو نے پانی کی جگہ آب شمشیر پیش کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ کلیب نے مرتے وقت مذکورہ شعر کہا تھا، جو عرب میں مشہور ہو گیا۔

دیکھیے اس شعر میں ''بعمرو'' کہہ کر شاعر نے ایک قصہ طلب شعر کے اعادے سے روک لیا۔

کلام مجید کی ایک آیت ہے، کمثل الحمار یحمل اسفارا یعنی جیسے گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں۔ اس آیت مبارکہ میں عربی کی ایک کہاوت کی طرف اشارہ ہے، جو ان الفاظ کے ساتھ مشہور ہے: اجھل من حمار و ابلد من عیر یعنی فلاں شخص گدھے سے

زیادہ نادان اور اس سے بڑھ کر احمق ہے۔

دیکھیے، اس کہاوت کی طرف اشارے سے معنی میں کتنا حسن اور زور پیدا ہو گیا۔

فارسی اور اردو زبان میں بھی اسی طرح قصے، شعر اور کہاوتیں تلمیحاً استعمال کی گئی ہیں۔ میرزا غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان میں جدت پسندی بہت تھی، نیز دماغ خلاق الفاظ و معانی پایا تھا۔ اسی بنا پر فارسی و اردو کی مشہور تلمیحوں کو انہوں نے نئے نئے انداز سے برتا اور اپنے مطالعہ کرنے والے کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان تمام قصوں سے آگاہ ہو، جن کی طرف اشعارِ غالب میں اشارے کیے گئے ہیں۔

مثلاً خضر کو لیجئے اور دیکھیے کہ اس ایک تلمیح سے غالب نے کیا کیا مطالب اور کیسے کیسے مضامین پیدا کیے ہیں، لکھتے ہیں۔

مشقِ نقشِ قدم، نسخۂ آبِ حیواں	جادۂ دشتِ نجف، عمرِ خضر کا طومار
جہاں مٹ جائے سعیِ دید، خضر آباد آسائش	بجیب ہر نگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا
مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب	عصای خضر صحرای سخن ہے خامہ بیدل کا
بحسرت گاہ نازِ کشتۂ جاں بخشی خوباں	خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا
سیر آں سوی تماشا ہے طلب گاروں کا	خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
حیرت انداز رہبر ہے عناں گیر، اے اسد	نقش ِ پای خضر، سدِ سکندر ہو گیا
کیجیے آہوی ختن کو خضر صحرای طلب	مشک ہے سنبلستانِ زلف میں گردِ سواد
وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں	رشتۂ عمر خضر کو نالہ نارسا سمجھ
اسد، "آب بخشیدن ز دریا" خضر کو کیا تھا	ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سمندر کی
ممکن ہے، کرے خضر سکندر سے ترا ذکر	گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا	گو شرف خضر کی بھی، مجھ کو ملاقات سے ہے
یا لگا کر خضر نے شاخ نبات	مدتوں تک دیا ہے آب حیات
حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز	دعا قبول ہو یا رب، کہ عمر خضر دراز

وہ زندہ ہم ہیں کہ روشناس خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں	جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
کیا کیا خضر نے سکندر سے	اب کسے رہنما کرے کوئی
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمر خضر	حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس	خضر بھی یاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم

ان شعروں میں جو صرف اردو دیوان میں مندرج ہیں، غالب نے خضر کی تلمیح کو کس انداز سے اور کتنے نئے نئے مطالب و معانی کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے، اہل ذوق اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص خضر کو ان کے تمام مالہ وماعلیہ کے ساتھ نہ جانتا ہو، اور ان کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے اس سے پوری آگاہی نہ رکھتا ہو، وہ ان اشعار یا ان جیسے شعرا کے کلام سے کیا لطف اٹھائے گا۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو فارسی شعرا کی تمام تلمیحات کو مرتب کر کے شائع کیا جائے۔

چونکہ غالب کے کلام کا عالمی سطح پر مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے غالب دوستوں کے اولین فرائض میں سے ہے کہ اس کی برتی ہوئی تلمیحوں کی محققانہ تشریح و توضیح کی جائے۔ مجھے بیحد مسرت ہے کہ میرے فاضل دوست جناب محمود نیازی صاحب نے جو بریلی کے شہرہ آفاق بزرگ شاہ نذیر احمد نیاز رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے ایک ذی علم اور صاحبِ ذوق فرد ہیں، یہ فرض انجام دے کر ارباب علم کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی خاطر خواہ قدر کی جائے گی اور ہمارے ملک اور بیرون ملک کے تمام غالب دوست اس پیش کش پر ان کے شکر گزار ہوں گے۔

خداوند عالم نیازی صاحب کو سلامت باکرامت رکھے اور اس سے بھی برتر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

امتیاز علی عرشی

دیباچہ

ہماری قدیم تاریخ، رسم ورواج ،اوہام و عقائد، مشاغل اور جنگ و جدل کے واقعات سے ہزاروں قصے کہانیاں اور داستانیں وابستہ ہیں۔ان کو جاننے سے ہم کو اپنی معاشرتی، تمدنی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ان میں جو تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئی ہیں ان کا علم حاصل ہوتا ہے اور پچھلے لوگوں کے تجربات سے فائدہ پہنچتا ہے۔ان طول طویل واقعات کو دہرانے سے چونکہ وقت ضائع ہوتا ہے اس لئے ایسے مختصر اشارے ایجاد کرلئے گئے ہیں جو ان قصے کہانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ان اشاروں کو علم بدیع کی اصطلاح میں تلمیح کہا جاتا ہے۔ان الفاظ کو سنتے ہی پورے واقعہ کی تصویر ہمارے سامنے خود بخود آجاتی ہے اور تفصیل کے ساتھ واقعہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ان اشاروں یا تلمیحی الفاظ کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ ان سے متعلق قصے، کہانیاں اور مسائل عام فہم ہوں اور ان کو دائمی شہرت حاصل ہو۔اگر وہ مشہور اور عام فہم نہیں ہیں تو ان کو تلمیح نہیں کہا جاسکتا ہے۔اس طرح وہ تمام لغت، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں تلمیح کے دائرے میں آتی ہیں جن سے قصہ یا کہانی وابستہ ہے اور عام طور پر لوگ ان کے قصوں سے واقف ہیں۔

تلمیح کو استعمال کرنے کا اصل مقصد کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب کی ادائیگی ہے۔ اگر ہر بات کو تفصیل سے کہا جائے اور طول طویل کہانیاں اور قصوں کو بار بار دہرایا جائے تو سننے والے بھی اکتا جاتے ہیں اور کہنے والے کا بھی وقت ضائع ہوتا ہے۔ اسی بات کو اگر اشاروں میں بیان کر دیا جائے تو گفتگو میں فصاحت اور بلاغت پیدا ہو جاتی ہے اور سامع کو بھی ہر بار نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ تلمیحی الفاظ گو مختصر ہوتے ہیں لیکن اپنے اندر وسیع مطالب پنہاں رکھتے ہیں۔ اس لیے علم و فضل رکھنے والے دانشور اور مدبر تلمیحی گفتگو پسند کرتے ہیں۔

صاحب المعجم مولانا شمس قیس تلمیح کی تعریف میں لکھتے ہیں۔۔

"تلمیح آنست کہ الفاظ اندک بر معانی بسیار دلالت کند و لمع جستن برق باشد و لمحہ یک نظر بود وچوں شاعر چناں سازد کہ الفاظ اندک بر معانی بسیار دلالت کند آں را تلمیح خوانند۔ وایں صنعت بہ نزدیک بلغا پسندیدہ تراز طناب است و معنی بلاغت آنست کہ آنچہ در ضمیر باشد، بہ لفظی اندک بے آنکہ بہ تمام معنی آں اخلالے راہ باید بیان کند و در آنچہ بہ بسط سخن احتیاج افتد از قدر حاجت در نگذارند۔ واہل نقد گفتہ اند بلاغت لفظ نیکوست با صحت معنی۔ و فصاحت پاکیزگی سخن است از دشواری بلاغت در سہ نوع سخن پیدا شد ایجاز و مساوات و بسط۔" (المعجم ص ۱۷۷)

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ تلمیحی الفاظ کی بنیاد مشہورات پر ہوتی ہے یعنی جو قصہ جس طرح بھی عام لوگوں میں مشہور ہے اس کو ویسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں عقل و نقل یا تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان سے ہمارے ادیبوں اور شعرا کے خیالات اور قوت تخیل کا اندازہ ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت تشبیہ دینے میں آسانی ہوتی ہے۔

طویل القامت اور احمق شخص کو عام طور پر عوج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ عوج بن عوق کی کہانی سب جانتے ہیں کہ یہ افسانوی شخص اس قدر دراز قامت تھا کہ نوحؑ کا طوفان اس کے کمر کمر تھا یا اس کے ساق پا سے رود نیل کا پل بنا تھا۔ تلمیحی نقطۂ نظر سے دراز

قامتی کا یہ ایک نادر نمونہ اور انوکھی تشبیہ ہے۔ حقیقت میں عوج بن عوق تھا بھی یا نہیں اس کی تحقیق کا کام علماء اور محققین کا ہے تلمیح نگار کا نہیں۔

تلمیحی الفاظ کے رواج سے ادیب اور شعراء کو آسانیاں فراہم ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور افکار کو مناسب سانچوں میں ڈھالنے پر قادر ہو جاتے ہیں اور کم وقت میں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ اس لئے ادبی حیثیت سے ان زبانوں کو مالدار سمجھا جاتا ہے جن میں تلمیحات کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی مثال ہی موجود ہے۔ اس میں ہر قوم، ہر مذہب اور ہر ملک کے لٹریچر کی تلمیحات شامل ہیں اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے شاہنامہ فردوسی، گلستان وبوستان، الف لیلیٰ ولیلیٰ، لیلیٰ مجنوں، شیریں وفرہاد اور اسی قسم کی سیکڑوں مشرقی علوم کی کتابوں سے تلمیحات اخذ کر کے ادبیات یورپ میں داخل کی جا چکی ہیں۔ برخلاف اس کے ہماری ہندستانی زبانیں اور خصوصاً اردو کا دامن تلمیحات سے خالی ہے۔ اس کی بہ ظاہر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ وقت کی بہتات اور مشاغل کی کمی کی وجہ سے ہم لوگ تفصیلی گفتگو کے عادی ہو چکے ہیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ "ہمارے ملک ہندستان کے لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تلمیح کی جگہ ہر قصے کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان کو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ تلمیح کے مفہوم کو جملوں میں ادا کرنے سے کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور ایک طول طویل واقعہ کو بار بار دہرانا سننے والوں کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے،،۔

اردو میں تلمیحات کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ اس زبان میں جو قدیم تلمیحات مستعمل ہیں ان سے واقفیت بھی دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ جن زبانوں سے اردو تلمیحات آئی ہیں اب خود ان کی مقبولیت کم ہو گئی ہے۔ ہمارے ذہن عام طور پر نئی تلمیح کو قبول کرنے پر آمادہ بھی نہیں ہوتے اور صرف ان الفاظ کو ہی تلمیح سمجھتے ہیں جو کتاب در کتاب (سینہ بہ سینہ ہیں) چلی آرہی ہیں اور درسی کتابوں تک محدود ہیں ان کی تشریح کا مسئلہ بھی کورس کی کتابوں میں دیے ہوئے مختصر سے "فٹ نوٹ،، سے حل ہو جاتا ہے۔ تلمیحات کی طرف سے اس بے اعتنائی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو میں تلمیحات پر کام بہت کم ہوا

ہے۔ تلمیحات کی کوئی فرہنگ موجود نہیں ہے اور تلمیحی الفاظ کی کوئی واضح تعریف اور شکل متعین نہیں ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو میں رائج تمام تلمیحات کو جمع کر کے مختلف موضوعات کی فرہنگیں مرتب کی جائیں۔ ان میں قدیم جدید، تاریخی غیر تاریخی، سیاسی ادبی اور مذہبی تلمیحات سب ہی موجود ہوں۔ شعرا اور ادیبوں نے جو تلمیحات ایجاد کی ہیں ان کو تلاش کیا جائے اور ہماری بول چال میں جو الفاظ تلمیح کی صورت اختیار کر چکے ہیں ان کو بھی تلمیحی فرہنگ میں شامل کر لیا جائے۔ مثلاً ایک جدید تلمیح "جنگ آزادی،، ہے۔ اس لفظ کو سنتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے وہ تمام واقعات سینما کے پردے کی مانند گزر جاتے ہیں جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اس عظیم جدوجہد آزادی میں پیش آئے۔ آزادی کے پرستاروں کی قید و بند کی مصیبتیں، دار و رسن کی آزمائشیں، حکومت کے مظالم اور اس کے جواب میں اختیار کئے گئے تمسک بالحق (ستیہ گرہ) کے طریقے۔ یہ سب واقعات سب لوگ جانتے ہیں اور مشہور ہیں۔ اس لئے یہ لفظ تلمیحی لفظ کی شرائط پوری کرتا ہے۔ اسی طرح سے بے شمار الفاظ ایسے جن کو تلمیحی فرہنگ میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اس فرہنگ کا سب سے بڑا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو صرف اپنی ذات یا اپنے آباء و اجداد کے کارناموں سے ہی رغبت رکھتے ہیں، تلمیحات سے دلچسپی لینے لگیں گے۔ تلمیحی واقعات عام لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہو جائیں گے اور پھر ان کا استعمال عام گفتگو اور بول چال میں بھی ممکن ہو سکے گا۔

یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی زبان کو بین الاقوامی سطح تک لانے اور اس میں فصاحت اور بلاغت پیدا کرنے لئے تلمیحات کا بہ کثرت استعمال ضروری ہے۔ اس لئے ایک اہم کام یہ کے اردو کے مستند ادیبوں اور شاعروں نے جو تلمیحات استعمال کی ہیں اور وہ تلمیحات جو انہوں نے اپنی ایجاد کی ہیں، ان سب کو تلاش کر کے یکجا کر دیا جائے۔ اردو کی بہت سی کتابیں مثلاً فسانۂ آزاد، باغ و بہار، مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن کی سیکڑوں تلمیحات ہمارے ادب میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ اکثر لوگ خوجی کی قرولی، جان عالم کا طوطا، مرزا ظاہر دار بیگ، اصغری اکبری، خواجہ سگ پرست، اختو بختو اور الہ دین کے چراغ کی تلمیحات کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے

شعراء ایسے ہیں جنہوں نے تلمیحات کا بکثرت استعمال کیا ہے جیسے میؔر، سوؔدا، نظیؔر، ذوقؔ، غالبؔ، رشکؔ، بحرؔ، قلقؔ، اور جاںؔ صاحب وغیرہ ایسے شعراء کی مخصوص تلمیحات کو جمع کر نے سے اردو کا دامن مالامال ہو سکتا ہے۔اس سلسلے میں مرزا غالبؔ کی تلمیحات پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا صاحب کا کلام تو ایک بحر ناپید اکنار ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس سے ہر شخص بقدر ظرف مستفیض ہو لیتا ہے۔ان کے کلام کا بڑا حصہ عام فہم اور آسان ہے لیکن جو باقی رہتا ہے وہ عام فہم و درک سے بلند ہے۔ان کے کلام کی نکتہ آفرینیوں فارسی محاوروں اور ترکیبوں اور مخصوص طرز بیان تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ان کے فلسفہ و تصوف کے غوامض اور عمیق اصطلاحات کو سمجھنے کے لئے ایک خاص بلوغت نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی وجہ سے ان کے کلام کی رمزیت نے ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی ہے۔مرزا غالب پر اس وقت بین الاقوامی سطح کا کام ہو رہا ہے اور تمام دنیا کے لوگ اس عظیم ہندوستانی شاعر کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔اس لیے یہ ضرورت ہے کہ ان کے کلام کی تمام اشکال واضح طور پر سامنے لائی جائیں تاکہ ان کے طالب علموں کو سہولت حاصل ہو۔اس سلسلہ کی ایک کڑی "تلمیحات غالب" بھی ہیں۔مرزا صاحب نے بھی دوسرے شعرا کی مانند کلام میں تلمیحات کا استعمال کیا ہے لیکن ان کی تلمیحات بھی ان کے خصوصی لب و لہجہ اور فلسفیانہ شاعری سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔اگر ان تلمیحات سے متعلق قصوں سے واقفیت نہ ہو تو ان کے کلام کا حقیقی لطف اٹھانا مشکل ہے۔ان کا ایک سادہ شعر ہے۔

در معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

یہ شعر دقیق نہیں بلکہ عام فہم ہے لیکن اس کے معنی کی وسعت کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو لقا کی ڈاڑھی اور عمر کی زنبیل سے واقف ہو اور یہ دونوں تلمیحات کسی لغت میں مل نہیں سکتی ہیں۔میری اس تالیف کا مقصد صرف ایسے ہی قصوں سے واقف کرانا

ہے۔ کیونکہ اس ضرورت کی طرف ابھی کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ اس وقت صرف ان کے اردو کلام کی تلمیحات کو جمع کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ آئندہ ان کے فارسی کلام کی تلمیحات کو بھی اس میں شامل کر کے یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ تلمیحات کی تلاش میں میرے سامنے دیوان غالب نسخہ عرشی کا زیر طبع ایڈیشن رہا ہے اس لئے ان میں ایسے اشعار بھی شامل ہیں جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرے گی اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے سہولت پیدا کرے گی۔

اس سلسلہ میں مجھے جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے باوجود اپنی علمی مصروفیات کے میرے مسودہ کا بہ نظر غائر مطالعہ فرمایا اور بہت سی خامیوں کی نشاندہی کی جو دور کردی گئی ہیں۔ رامپور کی لائبریری سے استفادہ کرنے کی جو سہولتیں مجھے ملی ہیں، ان کے لئے بھی میں عرشی صاحب اور دیگر اراکین لائبریری کا شکر گذار ہوں۔

اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میرا یہ کام برادر محترم ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی مد ظلہ، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی توجہ وعنایت کا نتیجہ ہے۔ آج سے تقریباً پندرہ سال قبل میں نے ان کی تحریک اور ترغیب پر اردو تلمیحات کا کام شروع کیا تھا جو بفضلہٖ تعالیٰ برابر جاری ہے۔

محمود نیازی

۲۴۔ دسمبر ۱۹۷۱ئش

ابن مریم

ابن مریم حضرت عیسیٰؑ کی کنیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نسبت مادری سے مخاطب کیا ہے حضرت آدمؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی ذات والا صفات ہی ایسی تھی جو توالد و تناسل کے عام قانون کے خلاف محض حکم الٰہی اور ارادہ باری تعالیٰ سے رحم مادر میں وجود پذیر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر کرنا تھا اس لئے ان کو بے پدر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهاً فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۞ (آل عمران۔۴۵) یعنی اے مریم بیشک اللہ بشارت دیتا ہے ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا (وہ) باآبرو ہوگا دنیا اور آخرت میں اور منجملہ مقربین کے ہوگا"۔ غالبؔ

ابن مریم ہوا کرے کوئی	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کا نام مریم بنت عمران تھا۔ ان کی ماں حنّہ کی منت پر مریم کو ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ جہاں آپ دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہتی تھیں۔ ایک دن جبرئیل فرشتہ نے انسانی صورت میں آکر بیٹا پیدا ہونے کی بشارت دی

تھی اور حضرت مریم کے گریبان میں پھونک دیا تھا اس طرح اللہ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا اور یروشلم سے تقریباً نو میل کوہ سراۃ (ساعیر) کے ٹیلہ پر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ یہ ٹیلہ اب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ قران وحدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے اللہ تعالیٰ سورۂ عمران میں فرماتا ہے کہ "دنیا کی تمام عورتوں میں تجھ کو برگزیدہ کیا" سورۂ کھیعص میں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرے میں کیا ہے اس طرح وہ دنیا کی پہلی عورت ہیں جن کو یہ شرف حاصل ہوا ہے۔

ابن مریم یعنی حضرت عیسیٰؑ کا شمار جلیل القدر اور الوالعزم پیغمبروں میں ہوتا ہے آپ کو مجدد انبیائے بنی اسرائیل بھی کہا جاتا ہے۔ جس طرح آنحضرت صلعم کو خاتم الانبیاء ورسل کہا جاتا ہے اسی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی خاتم الانبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ ان کے بعد آنحضرت صلعم تک ۵۷۰ سال کا زمانہ مکمل انقطاع وحی کا رہا ہے اس درمیان کوئی بھی نبی مبعوث نہیں ہوا۔

اسد اللہ اور حیدر

اسد اور حیدر دونوں کے معنی شیر کے ہیں۔ یہ حضرت علی[1] کرم اللہ وجہہ کے لقب ہیں۔ عربی زبان میں اسد کا استعمال بکثرت ہوا ہے کیونکہ عرب میں عام طور پر شیر نہیں ہوتے ہیں اس لئے وہاں بہادروں اور دلاوروں کو شیر سے تشبیہ دینے کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اسد اللہ (اللہ کا شیر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا لقب ہے جو ان کی بے پناہ طاقت اور غیر معمولی شجاعت پر آنحضرت صلعم نے عطا فرمایا تھا۔ ایک بار آپؐ نے ارشاد فرمایا"۔۔ یہ ابو سبطین یعنی حسنؑ اور حسینؑ کے باپ ہیں جو جوانان اہل بہشت کے سردار ہیں۔ یہ مجھ سے تکلیف دور کرنے والے اور اللہ کے شیر ہیں" دوسری روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دروازہ خیبر ایک جھٹکے سے اکھاڑ پھینکا تھا تو اس وقت اس لقب سے ممتاز فرمائے گئے تھے۔ غالبؔ

ا(حاشیہ:۔ ۱حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پیدائش ۱۳ ر عام الفیل مطابق تقریباً ۶۰۰ء میں خانہ کعبہ میں ہوئی تھی (مسعودی جلد ۲ ص ۳۵۸)

امام ظاہر و باطن، امیر صورت و معنی	علی، ولی، اسداللہ جانشین نبیؐ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک لقب حیدر بھی ہے جس کے معنی بھی شیر کے ہیں۔ حیدر اس شیر کو کہتے ہیں جو اپنی گردن اور پنجوں میں غیر معمولی طاقت رکھتا ہو۔ یہ لقب آپ کی والدہ فاطمہ نے رکھا تھا جن کے والد ماجد کا نام بھی اسد تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ معرکہ خیبر میں مرحب کی رجز کے مقابلہ میں حضرت علیؓ نے جو رجز پڑھی تھی اس کا مفہوم یہ تھا "میں وہ ہوں جس کی ماں نے اس کا نام حیدر رکھا ہے" اسی لئے حضرت علیؓ کو حیدر کرار (دشمن پر حملہ کرنے والا شیر) اور حیدر صفدر (چیر پھاڑ کرنے والا شیر) بھی کہا جاتا ہے۔ اسد اللہ خاں غالبؔ

اسد قدرت سے حیدر کی ہوئی۔ ہر گبر و ترسا کو	شرار سنگ بت، بہر بنائے، اعتقاد آتش

اعجاز مسیح

مسیح اور مسیحا دونوں حضرت عیسیٰؑ کے لقب ہیں۔ مسیح کے معنی مبارک و مسعود اور سیاح کے ہیں جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ یہ تمام خصائص حضرت عیسیٰؑ میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ مسیح سے مراد مسح کیا گیا بھی ہے مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب تولد ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر فرشتوں نے تیل سے مالش (مسح) کی تھی اسی لیے مسیح کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں چونکہ طب اور علم طبیعات کا بہت چرچا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے معجزے عطا کیے جو ان کی اُمّت پر اثر انداز ہوں اور یہ اعتراف کیا جا سکے یہ اعمال اکتسابی علم سے بلند و برتر ہیں اور محض رسول حق کی تائید میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رونما ہوئے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو یوں تو بے شمار معجزے عطا ہوئے تھے مگر قرآن مجید میں جن معجزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مردے کو زندہ کر دینے کا معجزہ اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو صحت مند کر دینے کا معجزہ اہم ہے۔ اعجاز مسیح کی تلمیح بھی ان دونوں معجزوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اُردو میں مسیح اور مسیحا کا استعمال بھی عموماً جاں بخشی کے لئے مستعمل ہے۔ غالبؔ

قبلہ نور نظر، کعبہ اعجاز مسیح	مژدۂ دیدۂ نخچیر سے فیض بیمار

غالب ؂

رنج تعظیم مسیحا نہیں اٹھتا مجھ سے	درد ہوتا ہے مرے دل میں جو توڑوں بالیں

حضرت عیسیٰؑ مردوں کو "قم باذن اللہ" کہہ کر زندہ کردیتے تھے۔ علاج معالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض ان کے پاس آتے اور ان کے لب کی ایک جنبش سے صحت پاکر شاداں وفرحاں اپنے گھروں کو جاتے۔ "لب عیسیٰ" کی تلمیح بھی اسی تاثیر صحت وشفا بخشی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی

قیامت۔ کشتہ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

حضرت عیسیٰ کے دم کی برکت سے نہ صرف بیماروں کو شفا ملتی تھی بلکہ مٹی کے بنائے ہوئے پرندوں میں جان پڑجاتی تھی شعرا نے اسی جاں بخشی کے معجزے کے لئے دم عیسیٰؑ کی تلمیح بھی استعمال کی ہے۔ غالب

وہ محض رحمت ورافت کی بہرا اہل جہاں	نیابت دم عیسیٰؑ کرے ہے جس کی نگاہ
مرگیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب	ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

مشہور ہے کہ خفاش (چمگادڑ) حضرت عیسیٰؑ کی ہی تخلیق ہے اسی لئے اس کو "مرغِ عیسیٰ" کہا جاتا ہے۔ انسانی بھول چوک کا اندازہ بھی اسی پرند کی خلقت سے ہوتا ہے کیونکہ اس کی بہت سی باتیں دوسرے پرندوں سے مختلف ہیں مثلاً یہ پرند منھ سے رفع حاجت کرتا ہے۔ اس کے چار پاؤں ہوتے ہیں۔ اس کی مادہ کو حیض آتا ہے اور وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ یہ پرند دن کو نابینا ہوجاتا ہے چوپاؤں کے مانند اس کے دانت ہوتے ہیں غرض کہ دوسرے تمام پرندوں سے اس کی شکل وصورت، عادت وخصلت اور ساخت مختلف ہے۔

افلاطون

مرزا غالب فرماتے ہیں ؂

کہ بحث علم میں اطفال ابجدی اس کے	ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام

افلاطون یونانی لفظ پلیٹو کا معرب ہے۔ افلاطون یونان کا مشہور فلسفی تھا جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ یہ حکیم اپنی دانش۔ حکمت اور فلسفہ میں ان یونانی حکماء میں شامل

ہے جن کی وجہ سے "عقل یونانی" دنیا میں مشہور ہوئی ہے کنایۃً فہم وادراک رکھنے والے دانشور کو کہا جاتا ہے۔

افلاطون چار سو بیس سال قبل مسیح کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ اس نے کم عمری سے ہی شعروشاعری میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ ابھی اس کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی کہ وہ سقراط کے استاد فیثاغورث کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی باتیں سننے لگا تھا اسی زمانہ میں افلاطون نے موسیقی پر کتابیں لکھنا شروع کی تھیں۔ فیثاغورث کی صحبت میں رہ کر اس کو فلسفہ سے بھی لگاؤ پیدا ہوا تھا لیکن جلد ہی فیثاغورث فوت ہو گیا۔ اس کا عزیز ترین شاگرد سقراط موجود تھا اس لئے وہ اس کا شاگرد ہو گیا اور پچیس سال تک استاد کی خدمت کرتا رہا ہے۔ اس لگن اور خدمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے امور عقیلہ میں فیثاغورث اور سیاست میں سقراط کا درجہ حاصل کرلیا۔ افلاطون اور سقراط دونوں نے یونانی فلسفہ کا فرقہ مشائیہ بھی قائم کیا تھا۔ مشی کے معنی عربی میں چلنے اور ٹہلنے کے ہیں یہ دونوں استاد و شاگرد چونکہ ٹہل ٹہل کر فلسفہ کی تعلیم دیتے تھے اس لئے مشائیہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

اسلامی فلسفہ بھی سب سے زیادہ افلاطون سے متاثر ہوا ہے اس کی متعدد تصانیف کے ترجمے مسلمانوں نے کیے ہیں مثلاً حنین بن اسحاق اور یحیٰی بن عدی نے افلاطون کی دو مشہور کتابوں کے ترجمے کتاب السیاسید کے نام سے کیے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں جمہوریت اور قانون سے متعلق ہیں۔ افلاطون کی سب سے مشہور کتاب "فلسفیات افلاطونہ" ہے اس میں ۳۵ مباحث اور ۳۰ مکتوبات طبیعات، سیاست منطق، تہذیب الاخلاق اور مختلف فنون سے متعلق شامل ہیں۔ سقراط کے مرنے کے بعد افلاطون نے مقام اتھنیہ میں ایک درس گاہ قائم کرکے ساری زندگی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا، یہ حکیم بے حد خوش الحان، قبول صورت، خوش مزاج اور شیریں بیان تھا۔ اس کی مجلس میں عورتیں بھیس بدل کر شریک ہوتی تھیں۔

صاحب غیاث اللغات نے کتب تواریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ افلاطون جب بوڑھا ہو گیا تو اس کے شاگردوں نے اس کی وصیت کے مطابق ایک بڑے خم (بڑا مٹکا) میں اس کو بٹھا کر اور خم منہ بند کر کے ایک پہاڑی غار میں رکھ دیا تھا اس کے بعد نہ معلوم ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا اسی لئے خم افلاطون کی تلمیح بھی مستعمل ہے۔ عمر کیا ہی دانا تھا کہ ساکن خم میں افلاطوں ہوا (ناسخ)

اورنگ زیبی

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا	مگر ہاں نام کو اورنگ زیبی

اس تلمیح میں مرزا غالبؔ نے "عالمگیری پھوڑے" کو ضرورت شعری کے لحاظ سے اورنگ زیبی نظم کیا ہے کیونکہ ابوالمظفر محمدؐ محی الدین اورنگ زیب (۱۶۱۸ـ۱۷۰۷ء) کا لقب "عالمگیر" بھی تھا۔ "عالمگیری پھوڑا" ایک قسم کا سوداوی مادہ ہے جو پھوڑے کی شکل میں عام طور پر گال پر نکلتا ہے اور مشکل سے ٹھیک ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جب اورنگ زیب بادشاہ نے ابوالحسن تاناشاہ کا محاصرہ گولکنڈے (دکن) کے مقام پر کیا تھا تو مغل سپاہی دکن کی آب و ہوا کے عادی نہ تھے۔ محاصرے نے جب طول پکڑا تو آب و ہوا کی خرابی سے سپاہیوں کے پھوڑے نکل آئے تھے جو وبائی شکل اختیار کر گئے تھے ایک تو اورنگ کے نام سے مناسبت اور دوسرے عام وبائی صورت کی وجہ سے ان پھوڑوں کو "عالمگیری پھوڑے" کہا جانے لگا جو آج تک مشہور ہے۔ جہاں تک عالمگیری کی معنوی وسعت کا سوال ہے وہ اورنگ زیبی سے پوری نہیں ہو سکی ہے۔

اولیں دور امامت اور وصی ختم رسل

مرزا غالبؔ کے دو شعر ہیں ؎

رنگریز گل و جام دو جہاں نازو نیاز	اولین دور امامت طرب ایجاد بہار
جاں پنا ہا دل و جاں فیض رساناں شاہا	وصیؔ ختم رسل تو ہے ۔ بہ فتوائے یقیں

اولین دور امامت سے مراد ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دور جن کو مرزا غالبؔ وصی رسول جانشین رسول اور پہلا امام مانتے تھے۔ مولانا حالی مرحوم نے مرزا غالبؔ کے عقیدے کے متعلق "یادگار غالبؔ" میں لکھا ہے :

> "اگرچہ مرزا کا مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا ہے اور جناب امیر (حضرت علیؓ) کو وہ رسول خدا کے بعد تمام اُمّت سے افضل سمجھتے تھے"۔

مرزا غالبؔ نے اپنے اس عقیدے کا اظہار اپنے کلام اور متعدد خطوط میں کیا ہے

چنانچہ حاتم علی مہر کو اپنے ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"صاحب میں اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا خاتمہ بھی اسی عقیدے پر ہو"

مرزا غالب حضرت علیؑ کو حقیقی جانشین رسول بلا فصل سمجھتے تھے اس کی وضاحت انھوں نے حضرت غمگین شاہجہاں اکادمی کو لکھے گئے ایک خط میں اس طرح کی ہے:

"من علی را امام دانم و دیگراں را خلیفہ۔ خلافت مرادف سلطنت وریاست است بزبان عرب رئیس و حاکم را خلیفہ گویند اگرچہ لغوی معنی نیابت است بالجملہ علی را بلا فصل بعد از نبی امام است و امامت امر است یزدانی و علی امام است" (خط دوازدہم۔ غمگین اکاڈمی۔ گوالیار)

مرزا غالب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو امام اول کے علاوہ وصی رسول بھی سمجھتے تھے۔ وصی کے لغوی معنی ہیں جس کو وصیت کی گئی ہو اور اصطلاحی معنی جانشین اور وارث کے ہیں اس وصیت کا اشارہ آنحضرت صلعم نے حجتہ الوداع کے موقع پر دیا تھا۔ آپؐ نے آخری حج کے بعد ایک بڑے مجمع کے سامنے ایک الوداعی خطبہ دیا تھا اور اسی موقع پر ایۂ اکملت لکم دینکم نازل ہوئی تھی۔ یہ آخری خطبہ مقام "غدیر خم" پر ۱۸/ ذالحجہ ۱۰ھ کو دیتے ہوئے آپ نے اسلام کے اولین فرض یاد دلائے تھے اور فرمایا تھا:

"بعد حمد و ثنا۔ اے لوگو! میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے خدا کا فرشتہ جلد آجائے۔ اور مجھے قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک خدا کی کتاب ہے جس کے اندر ہدایت کی روشنی ہے اس کی مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں جن کے بارے میں میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں"

آخری جملہ آپ نے تین بار زور دے کر فرمایا تھا۔ یہ روایت صحیح مسلم کی ہے اس کی علاوہ نسائی۔ مسند احمد۔ ترمذی اور حاکم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے ان سب روایتوں میں یہ فقرہ مشترک ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا "الٰہی جو علی سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے تو تو بھی اس سے عداوت رکھ"

غالبؔ

تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے ولیکن بہ تضاد	وصی ختم رسل تو ہے بہ اثبات یقیں

ایرج و تور۔ خسرو و بہرام۔ گیور گودرز۔ بیژن و رہام

یہ نام ایران کے قدیم قومی افسانے کے بادشاہوں اور پہلوانوں کے ہیں۔ ان کا ذکر غالبؔ نے ان شعر میں کیا ہے

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے	ایرج و تور، خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے	گیور گو درز، بیژن و رہام

ایرج و تُور

یہ دونوں پیشدادی خاندان کے الوالعزم بادشاہ فریدوں بن آبتیں کے بیٹوں کے نام ہیں اس کو طہمورث دیو بند کی اقرب اولاد سے بتایا جاتا ہے۔ فریدوں کا عہد حکومت آرام وراحت اور سکھ چین کا دور تھا مگر وہ اپنے تینوں بیٹوں ایرج۔ سلم اور تور کے باہمی جھگڑوں سے بہت پریشان رہتا تھا سلم و تُور تو دونوں حقیقی بھائی ایک ماں سے تھے جو ضحاک کی بیٹی تھی لیکن ایران دخت کا بیٹا ایرج تھا یہ ایک خالص ایرانی انسل شہزادی تھی۔ فریدوں نے اپنی سلطنت کو تینوں بیٹوں میں اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ سلم کو روم کا مقبوضہ علاقہ اور تور کو تاتار اور چین ملا تھا اور ایرج کے حصہ میں سلطنت ایران آئی تھی۔ سلم و تور اس تقسیم سے ناراض تھے اس لئے انھوں نے بڑی بے رحمی سے ایرج کو مار ڈالا کسی طرح سے اس کی ایک حاملہ بیوی بچ نکلی تھی اس کے بطن سے منوچہر پیدا ہوا۔ منوچہر نے بڑے ہو کر اپنے دادا (فریدوں) کی مدد سے دونوں سوتیلے چچاؤں سے باپ کا انتقام لیا اور دونوں کو ہلاک کر دیا۔ فریدوں نے اپنی موت سے قبل ہی منوچہر کو اپنا وارث قرار دے کر اس کی تخت نشینی کے مراسم ادا کر دئے تھے۔

خسرو

یہ ایران کا مشہور بادشاہ تھا جو ہرمنر ثالث کا بیٹا اور نوشیرواں عادل کا پوتا تھا۔ کیانی

خاندان کا یہ بادشاہ افسانوی ادب میں خسرو پرویز کے نام سے مشہور ہے (تفصیلی حالات تلمیح "طلائے دست افشار" میں دیکھیں)

<u>بہرام</u>

بہرام کے نام سے ساسانی خاندان میں پانچ بادشاہ گزرے ہیں لیکن اُردو فارسی ادب میں بہرام سے مراد عام طور پر بہرام پنجم (۴۳۰۔۴۳۸ء) سے ہے جو "بہرام گور" بھی کہلاتا ہے۔ یہ بادشاہ یزگرد اوّل کا بیٹا تھا۔ یہ بہت تیز اور سرکش انسان تھا۔ اس کو گورخر کے شکار کا بھی بہت شوق تھا۔ مشہور ہے کہ اس نے ایک بار گورخر کو دبوچے ہوئے شیر کو ایک ہی تیر سے شکار کر لیا تھا۔ اس کی موت کا سبب بھی ایک گورخر ہی بنا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک گورخر کا تعاقب کرتے وقت وہ کسی گڑھے میں گر کر غائب ہو گیا تھا ممکن ہے اسی لئے اس کو گور کہا جاتا ہو کیونکہ گور کے معنی بھی قبر یا گڑھے کے ہیں۔ اس تجنس کو عمر خیام نے اپنی ایک رباعی میں بھی نظم کیا ہے۔

آں قصر کہ جمشید دردجام گرفت	آہو بچہ کردوشیر آرام گرفت
بہرام کہ گورمی گرفتی دائم	دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

بہرام گور ساسانی خاندان میں اردشیر اول اور خسرو (نوشیرواں) کو چھوڑ کر سب سے بردل عزیز بادشاہ گزرا ہے اس نے اقوام شمالی اور بزنطینی حکومت کے خلاف بہادری کے جو کارنامے دکھائے تھے ان کے قصے بہت مشہور ہیں اسی طرح اس کے عشق کی داستانیں بھی زباں زد عوام ہیں ان پر شعرا نے صدیوں تک رزمیہ نظمیں کہی ہیں اور مصوروں نے تصویریں بنائی ہیں۔ ایران میں قالینوں اور آرائشی پردوں پر بہرام گور کے شکار کی تصویریں بنانے کا عام رواج رہا ہے۔ لینن گراڈ میں ہرمیتاژ کے عجائب خانے میں اب بھی ایک ایسا پیالہ موجود ہے جس پر بہرام کی تصویر بنی ہے وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک اونٹ پر سوار ہے اور اپنی محبوبہ کے اشارے پر اپنے تیر سے ہرنی کو نر اور نر کو مادہ اس طرح بنا رہا ہے کہ مادہ کے سر پر تیر اس طرح پیوست کر دئے ہیں کہ وہ نر معلوم ہو رہی ہے اور نر کے سینگ اپنے دوشاخہ تیر سے اڑا دئے ہیں بہرام گور موسیقی کا بھی دلدادہ تھا اور صفات پسندیدہ کا مالک تھا۔ ۴۳۸ء میں اس کی وفات ہوئی۔ غالبؔ

چھوڑتا دیتا تھا گور کو بہرام	ران پر داغ تازہ دے کے وہیں

خاص بہرام کا ہے زیب سریں	اور داغ آپ کی غلامی کا

گیو۔ گورزاوربیژن

یہ تینوں ایران کے نامور پہلوان تھے ان تینوں نے کیانی بادشاہوں کی ملازمت میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ صاحب فرہنگ جہانگیری نے گودرز نام کے دو پہلوان لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک قارن کا بیٹا اور کاوہ آہنگر کا پوتا تھا۔ وہ مملکت صفاہان کا والی تھا۔ دوسرا پہلوان شواد کا بیٹا اور گیو کا باپ تھا مرزا غالبؔ بھی آخرالذکر گودرز کا ذکر کیا ہے۔ گیو کے بیٹے کا نام بیژن تھا جو اپنی شجاعت اور افراسیاب کی بیٹی منیژہ کے عشق کی وجہ سے ایران کے قومی افسانے میں بہت مشہور ہے۔ ایران اور توران کی جنگ میں ان تینوں دادا، پوتے اور بیٹے، رستم کی مانند کیانی بادشاہوں کے لئے دلاوری اور شجاعت کے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔

گیو کا بیٹا بیژن ایک بار افراسیاب (والئی توران) کی قید میں پھنس گیا تھا اس کا قصہ فردوسی نے اس طرح لکھا ہے کہ ایک بار کیخسرو نے جنگلی سوروں کے استحصال کے لئے گرگیں نام کے ایک پہلوان کے ساتھ سرحد پر بھیجا تھا۔ بیژن نے چند روز میں ہی وہ علاقہ جنگلی سوروں سے پاک صاف کر دیا۔ گرگیں بہت کاہل اور کام چور تھا اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ بادشاہ کے خوف سے اور سوروں کے خاتمہ کا سہرا اپنے سر باندھنے کی غرض سے گرگین نے بیژن کو دھوکا دے کر توران کی سرحد میں پھنسوادیا وہاں اس زمانہ میں افراسیاب کی بیٹی منیژہ شکار کے لئے آئی ہوئی تھی۔ بیژن اور منیژہ ایک دوسرے کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ منیژہ اپنے ساتھ بیژن کو بھی لے گئی اور محل میں اس کو چھپالیا۔ افراسیاب کو جب یہ خبر ملی تو اس نے بیژن کو ایک تاریک کنویں میں قید کر دیا۔ یہ کنواں اب بھی چاہ بیژن کے نام سے مشہور ہے۔

دوسری طرف کیخسرو نے جام جہاں نما میں بیژن کی قید کا احوال معلوم کر کے رستم کو اس کی مدد کے لئے بھیجا تھا جو ایرانی سوداگروں کے بھیس میں توران پہنچا اور بیژن کو تنگ و تاریک کنویں سے نجات دلا کر افراسیاب کو زبردست شکست دی۔ ایران پہنچ کر بیژن کی شادی منیژہ سے ہو گی۔

رُہام (مابضم وتشدید ہا) گودرز کے بیٹے کا نام ہے۔ تاریخ میں یہ بخت نصر کے نام سے مشہور ہے۔ یہودی اس کو ہی بنو کد کہتے ہیں۔ ایران کے مشہور بادشاہ لہراسپ نے رہام کو عراق اور عجم کا والی مقرر کیا تھا اور مغرب کی طرف سلطنت کو وسیع کرنے کا حکم دیا تھا۔ تاریخ میں بخت نصر کو بہت بڑا ظالم دکھایا گیا ہے۔ اس نے یروشلم پر حملے کر کے لاکھوں یہودیوں کا قتل عام کیا تھا اور جو یہودی زندہ بچے تھے ان سب کو لونڈی غلام بنا کر وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب بخت نصر کے مظالم کی حد نہ رہی تو گشتاسپ (لہراسپ کا بیٹا) نے اس کو معزول کر دیا تھا۔

آتش پرست

آتش پرست آگ کو پوجنے والے کو کہتے ہیں یعنی مجوسی۔ گبر اور زردشت کا ماننے والا۔ آتش پرستی ایران کا قدیم ترین مذہب تھا۔ فردوسی نے لکھا ہے کہ پیشدادی خاندان کے دوسرے بادشاہ ہوشنگ نے سب سے پہلے چقماق کو رگڑ کر آگ دریافت کی تھی اور نور خدا سمجھ کر اس کی پرستش کا حکم دیا تھا لیکن آتش پرستی کی اصل ابتدا اور قدیم مذہب کی اصلاح زردشت کے زمانہ سے ہوئی تھی۔ ابراہیم زردشت نے ۵۵۰ ق م کے درمیان ایران کے شمالی حصہ وادی ارس میں ظہور کیا تھا۔ اور شاہ گشتاسپ بھی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے ابراہیم زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی اس بات کا ثبوت ان پر نازل شدہ کتاب "اوستا" کے ابتدائی جملوں سے ملتا ہے جن کا مفہوم دوسری الہامی کتابوں جیسا ہے ان میں شیاطین سے پناہ مانگی گئی ہے اور خدائے رحمٰن اور رحیم کی مدح وثنا کی گئی ہے۔ اوستا میں تحریف کے باوجود بھی آنحضرت صلعم کی بعثت اور دین اسلام کی بشارت اس کتاب میں موجود ہے۔

پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات میں لکھا ہے کہ زردشت واقعی تاریخی انسان تھے اور فرقہ مجوسی میں میڈوی قوم کے ایک فرد تھے۔ ان کا زمانہ تقریباً ۶۰۰ سال قبل مسیح کا ہے جب کہ میڈیا کی سلطنت قائم تھی اور ہخامنشی خاندان کا وجود بھی نہ تھا۔

موجودہ مذہب زردشتی کو اردشیر بابکانی نے ازسرنو ترتیب دیا تھا کیونکہ اصل اوستا کو اردشیر سے ۵۰۰ سال قبل سکندر یونانی نے جلا کر نیست و نابود کر دیا تھا۔ اب موجودہ مذہب کو ہی مجوسیت کہا جاتا ہے۔ غالب ؎

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے	سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

آخری چہار شنبہ

ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ مسلمانوں کا یوم مسرت ہے کیونکہ اس دن آنحضرت صلعم نے ایک طویل اور پیچیدہ علالت سے صحت یاب ہو کر غسل صحت فرمایا تھا اور سبزے پر کچھ دیر چہلقدمی بھی فرمائی تھی۔ اب مسلمانوں میں اس دن سبزے کو روندنا۔ باغوں میں جانا اور چہلقدمی کرنا مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلعم صفر کے آخری چہار شنبہ کو علیل ہوئے تھے اس لئے مسلمانوں نے اس دن دعائے صحت کی تھی اور صدقہ و خیرات کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا۔ اسی وقت سے باغوں میں جا کر پند و غط کے جلسے ہونے لگے اور امراء میں سنہری روپلی چھلّے تقسیم کرنے کا بھی رواج ہو گیا۔ یہ رسم مغلیہ بادشاہوں کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی۔ آخری مغل بادشاہ ابوالمظفر سراج الدین محمدؒ بہادر شاہ ۱۷۷۵۔ ۱۸۶۲ء کے یہاں یہ دن بہت دھوم دھام سے لال قلعے میں منایا جاتا تھا۔ بادشاہ ایک مٹی کی ہانڈی اشرفیاں بھری اپنے پاؤں سے توڑ کر خیرات کرتے تھے۔ گھاس کو روندا کرتے تھے۔ لال قلعہ پر چراغاں ہوتا تھا۔ پکوان پکتے تھے اور ارا کین سلطنت کو انعامات تقسیم کیے جاتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے سونے اور چاندی کے چھلّے بھی تقسیم ہوتے تھے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو	رکھ دیں چمن میں بھر کے مۓ مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست	سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں	ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے	لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

آدم وخُلد

(آدم سریانی لفظ ہے بائبل میں اس کو الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ عربی لفظ ادمت (سزاوار امامت) سے ماخوذ ہے اور بعض کے نزدیک ادیم (روئے زمین) سے بنا ہے)

حضرت آدمؑ وہ پہلے انسان تھے جنہوں نے اس کائنات ارضی پر قدم رکھا۔ انسانوں کی نسل پھیلائی اور خلافت حق کا مقدس مقصد پورا کیا۔ نسل انسانی کے اس مورث اعلیٰ کو ابوالبشر (انسان کا باپ)۔ صفی اللہ (اللہ کا دوست) اور باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو جب اس دنیا میں اپنا خلیفہ بھیجنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے سب سے پہلے کھنکھناتی مٹی سے آدم کا پتلا طیار کیا اور پھر اس میں روح پھونکی تو وہ گوشت و پوست کا انسان بن گیا پھر تمام فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کریں سب نے حکم کی تعمیل کی لیکن عزازیل فرشتہ نے سجدہ نہ کیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اِنِّی خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ۝ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ۝

یعنی میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی۔ سو جب اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں جان ڈال دوں تو تم سب (فرشتے) اس کے روبرو سجدے میں گر پڑنا۔ سو سارے فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس بات کو نہ مانا۔ (الحجر۔۱۵۔۲۶)

عزازیل (ابلیس) فرشتہ کا علم و فضل تمام فرشتوں سے بڑھا ہوا تھا اور فرشتوں کی تعلیم و تلقین اس کے سپرد تھی اسی لئے وہ معلم الملکوت کے لقب سے ممتاز تھا اس نے آدم کو سجدہ کرنے میں اپنی توہین محسوس کی اور سجدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی وقت اس کے تمام مراتب چھین لئے گئے اور شیطان و ابلیس[1] کا لقب دے کر طوق لعنت اس کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ پھر بارگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا۔ حضرت آدم مدت تک تنہا زندگی گزارتے

---

[1] (حاشیہ:۔ ابلیس کی اصل بلس ہے یعنی خدا کی رحمت سے ناامید ہونا۔ ابلیس کو جب جنت سے نکالا گیا تو اس نے توبہ وندامت کی جگہ قیامت تک کی مہلت طلب کر لی تھی اور کہا تھا کہ اب میں بنی آدم کو گمراہ کروں گا اور اس کو ناشکرا بناؤں گا اس دن سے شیطان اس کام میں مصروف ہے۔)

رہے جب ان کی فطرت کسی مونس وہمدم کی جویا ہوئی تو اللہ تعالی نے حوا[1] کو پیدا کیا اور دونوں کو جنت میں قیام کی اجازت مل گئی۔ غالب

چاہے گر جنت، خبر آدم، وارث آدم نہیں	شوخی ایمان زاہد، مستی تدبیر ہے

دونوں میاں بیوی کو ایک درخت معین کر کے بتادیا گیا تھا کہ وہ نہ تو اس کو چھوئیں اور نہ اس کے قریب جائیں۔ شیطان ان کو گمراہ کرنے کی تاک میں تھا اس نے حوا کو شجر ممنوعہ[2] کا پھل کھانے کی ترغیب دی۔ حضرت آدم کے بشری خواص میں پہلی بار بھول چوک نے ظہور کیا۔ اور انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اشعاعی کو بھلا بیٹھے۔ اس پھل کا کھانا تھا کہ ان کے بشری لوازم ابھرنے لگے سب سے پہلے تو ان کو اپنی برہنگی کا احساس ہوا اور دونوں نے اپنے ستر ڈھانپ لیے۔ اس طرح تمدن انسانی کی ابتدا ہوئی۔ دوسری طرف حکم عدولی پر فوراً ہی باز پرس ہوئی حضرت آدم نے عجز و ندامت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ اور عفوودرگزر کے طالب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے عذر کو قبول کرتے ہوئے ایک معینہ مدت تک زمین پر قیام کا حکم دیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل سورۂ اعراف میں دی ہوئی ہے۔ غالب

نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر	جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جنت سے نکل کر حضرت آدم نے سب سے پہلے کوہ سراندیپ (سیلون) پر قدم رکھا اور وہاں دو سو سال تک بغیر رفیقۂ حیات کے رہے۔ اس پہاڑ پر حضرت آدم کے قدم کا نشان اب بھی موجود ہے جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے۔ حضرت آدم کو سراندیپ سے جبرئیل

1۔ (حضرت آدم کی رفیقہ حیات اور دنیا کی پہلی عورت کا نام حوا تھا چونکہ وہ ہر انسان حی (زندہ السان) کی ماں ہیں اس لیے مبالغہ کا صیغہ بنا کر حوا نام رکھا گیا۔ حوا کی پیدائش کے متعلق قرآن میں صرف اتنا مذکور ہے "وَخلق منها زوجها" یعنی اس (نفس) سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ یہ اسرائیلی روایت ہے کہ حوا کی پیدائش آدم کی بائیں پسلی سے ہوئی تھی۔ بخاری اور مسلم نے اس روایت کی تصدیق کی ہے)

2۔ (قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے شجر ممنوعہ (شجر خلد) کی وضاحت نہیں کی ہے کہ وہ کس چیز کا تھا۔ مفسرین کے نزدیک وہ گندم کا درخت تھا اردو شاعری میں بھی اس کو گندم ہی مانا گیا ہے۔ انجیل کی کتاب پیدائش کے بیان میں اس درخت کو "شجر تعقل" یعنی علم، عقل اور حکمت کا درخت لکھا گیا ہے۔)

مقام عرفات پر لئے گئے جہاں ان کی ملاقات حواؔ سے ہوئی۔ طبرؔی اور ابن اثیر کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکم پر انھوں نے تعمیر خانہ کعبہ کا کام شروع کیا اور جبرئیل نے ان کو مناسک حج کی تعلیم دی۔ مشہور ہے کہ حضرت آدم ایک ہزار سال کی عمر لے کر آئے تھے جس میں سے انھوں نے چالیس سال حضرت داؤدؑ کو بخش دیے تھے جوان سے آگے آنے والے پیغمبر تھے اس طرح وہ (آدم) کل نو سو ساٹھ برس تک حیات رہے۔ مشہور ہے کہ ان کی وفات جمعہ کے دن ہوئی تھی اور وہ کوہ بوقبیس میں مدفون ہوئے۔

شعرا نے قصہ آدم کو طرح طرح سے رنگ دے کر لکھا ہے کوئی تو ان کو خلد سے نکالتا ہے اور کوئی گناہ آدم سے تعبیر کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا خلد[1] سے آکر دنیا میں نسل انسانی کی شروعات کرنا ہی مشیت ایزدی تھی اور اسی لئے ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ اسی طرح ان کا گناہ بھی ایک معمولی لغزش یا دوسوسہ تھا۔ حضرت آدم کی عصمت کے مسلہ کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں صاف کر دیا ہے وہ فرماتا ہے "ہم نے اس اقرار کو پورا کرنے میں اس کے ارادے یا قصد کا دخل نہ پایا"۔ غالبؔ

نکلنا خلد سے۔ آدم کا۔ سنتے آئے ہیں لیکن	بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

آل عبا

آل کی اصل اہل ہے جس کے معنی نسل۔ خاندان اور اولاد کے ہیں۔ آل عبا سے مراد ان حضرات سے ہے جن کو آنحضرت صلعم نے اپنی عبا میں لے کر آیۂ تطہیر پڑھا تھا اور اپنی اولاد ہونے کی تصدیق کی تھی۔ احمد، مسلم، ابن ابی شیبہ اور ابن حرو غیرہ نے جناب عائشہ صدیقہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن آنحضرت صلعم گھر میں تشریف لائے تو ایک گلیم سیاہ رنگ کی اوڑھے ہوئے تھے۔ جب حضرت امام حسن تشریف لائے تو آپ نے ان کو بھی اپنی گلیم میں لے لیا۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسینؑ تشریف لائے تو آپ نے ان دونوں حضرات کو بھی اپنی گلیم میں داخل فرمالیا۔ تھوڑی دیر کے بعد

---

[1] (خلد کے معنی بقائے دائم اور ہمیشگی کے ہیں۔ اصطلاحی معنی بہشت کے ساتویں طبقہ کے ہیں۔ عام طور پر بہشت مطلق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے)

جب جناب سیدہؓ آئیں تو آپ نے ان کو بھی گلیم میں لے کر یہ آیت پڑھی۔ "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً، یعنی اے الٰہی یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے نجاست دور فرما اور ان کو اچھی طرح سے پاک کردے"۔ یہ سن کر جناب ام سلمہؓ نے دریافت فرمایا "یارسول اللہ! کیا میں بھی ان میں سے ایک ہوں؟" آنحضرت صلعم نے جواب میں ارشاد فرمایا "انک علی خیر" یعنی تم اچھی ہو یا نیکی پر ہو" اس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی اولاد کو "آل عبا" کہا جاتا ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ آل عبا کے علاوہ اولاد رسول میں اور لوگوں کو بھی شامل کرنا چاہیے بعض نے ازواج مطہرات کو بھی شامل کیا ہے لیکن مقاتل، ابو سعید، خدری، انس بن مالک، جناب عائشہؓ اور علماء کی اکثریت کا فیصلہ یہی ہے کہ آل رسولؐ میں صرف آل عبا ہی شامل ہیں۔ تابعین بھی اسی فیصلہ کے قائل ہیں۔ غالبؔ

نہ بادشاہ، نہ سلطان، یہ کیا ستائش ہے	کہو کہ خامس آل عبا کہیں اس کو

آہوئے ختن / آہوئے دشت تتار

ختن حدود چین کا ایک مشہور شہر ہے جہاں مشکی ہرن ہوتا ہے اس کو کستوریا ہرن بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا چکارا ہے جس کے اگلے پاؤں میں جوڑ نہیں ہوتے ہیں اور اس کے دم بھی نہیں ہوتی ہے اس کا رنگ سیاہ یا سنہرا ہوتا ہے۔ گردن کے نیچے حلقوم کے پاس دو سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ مشہور ہے کہ اس ہرن کی ناف میں کھال اور گوشت کے درمیان ایک تھیلیاں یا چھالہ سا ہوتا ہے جس میں گاڑھا خون اور کچھ برادہ سا بھرا ہوتا ہے اس میں سے ہی خوشبودار مادہ برآمد ہوتا ہے جس کو مشک کہتے ہیں اور اس تھیلا کو نافہ کہا جاتا ہے۔ غالبؔ

کیجئے آہوئے ختن کو، خضر صحرائے طلب	مشک ہے، سبنلستان زلف میں، گرد سواد
جس جا نسیم شانہ کش زلف یار ہے	نافہ دماغ آہوئے دشت تتار ہے

باغ رضواں

باغ رضوان جنت کو کہتے ہیں۔ رضوان (بالکسر) کے معنی خوشنودی کے ہیں۔ صراح اور غیاث اللغات نے موکل دربان بہشت کا نام رضوان لکھا ہے۔ مذہبی روایتوں میں بھی رضوان کو "داروغہ بہشت" کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ جنت کا تمام اندرونی انتظام اور بہشتیوں کی خاطر مدارات کا اہتمام اسی فرشتہ کے سپرد ہے اسی لئے جنت کو باغ رضواں کہا جاتا ہے۔ غالبؔ

کہا میں صید ہوں۔اس کا کہ جس کے دام گیسو میں	پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر۔باغ رضواں سے
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی	گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

بت خانۂ آزر

بتخانہ آزر کنایۃً ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں حسینوں اور معشوقوں کا مجمع ہو۔ آزر حضرت ابراہیمؑ کے مشرک باپ کا نام تھا وہ اپنے ملک کے سب سے بڑے ہیکل کا بڑا پجاری تھا اس کے علاوہ وہ ماہر بت تراش اور بتوں کا بیوپاری بھی تھا اس کے یہاں قسم قسم کے بت ہر وقت فروخت کے لئے طیار رہتے تھے اسی لئے آزر کا بتخانہ تلمیحاً مستعمل ہے۔

توراۃ میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ اور قرآن مجید میں آزر بتایا گیا ہے ناموں کے اختلاف کی وجہ علما کے نزدیک یہ ہے کہ تارخ اسمی اور آزر وصفی نام ہے۔ دراصل کالدی زبان میں آدار بڑے پجاری کو کہتے ہیں تارخ چونکہ بڑا پجاری تھا اس لئے آدار معرب ہو کر آزر بن گیا۔

قرآن مجید کے سورۂ الانعام میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ تو بتوں کو معبود سمجھتا ہے بیشک میں تجھ کو اور تیری قوم کو صریح غلطی پر دیکھتا ہوں"۔

حضرت ابراہیمؑ نے آزر کو راہ راست پر لانے کی ہر چند کوشش کی لیکن جب وہ کفر و ضلالت کی زندگی چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو انھوں نے اپنے باپ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ غالبؔ

نقش پاکی صورتیں وہ دل فریب	تو کہے بُت خانہ، آزر کھلا

بوتُراب

بوتراب کے معنی ہیں "مٹی کا باپ" یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پسندیدہ کنیت ہے۔ اس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ آنحضرت صلعم نے جب مکہؔ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے کا بھائی بنادیا تھا تاکہ مہمان نوازی کا بار بٹ جائے۔ ان مہاجرین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی شامل تھے لیکن ان کو کسی کا بھائی نہیں بنایا گیا۔ اس بات پر آپ اداس ہو کر مسجد نبوی کے کچے فرش پر جاکر لیٹ گئے اور کچھ دیر کے بعد نیند آگئی۔ ہوا کے چلنے اور مسجد کے کچے فرش کی وجہ سے آپ کا جسم مبارک [illegible] آلود ہو گیا۔

آنحضرت صلعم جب مسجد میں تشریف لائے تو آپ نے حضرت علی کرم وجہہ کے جسم پر گرد و غبار کو دیکھ کر از راہ شفقت فرمایا "قم یا اباتراب" یعنی اٹھ اے مٹی کے باپ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اسی وقت بیدار ہو گئے۔ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "میں نے مہاجرین اور انصار میں رشتہ اخوت قائم کیا ہے لیکن تم کو اس لئے کسی کا بھائی نہ بنایا کہ تم میرے بھائی ہو۔ تم میرے لئے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰ کے لئے ہارون حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا"۔ اسی وقت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ کیفیت مشہور ہو گئی ہے۔

غالبؔ ؎

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست	مشغول حق ہوں۔ بندگی بوتراب میں

بوئے یوسف / بوئے پیراہن

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسدؔ	دی نے برباد کیا پیر ہنستاں میرا

بوئے یوسف سے مراد ہے حضرت یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو جس کی تاثیر سے حضرت یعقوبؑ کی کھوئی ہوئی بینائی واپس آگئی تھی۔

حضر یوسفؑ بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر تھے ان کے دس سوتیلے بھائی اور ایک حقیقی بھائی بن یمین تھا۔ حضرت یوسفؑ نے ایک دن ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمران کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اس خواب کو سن کر حضرت یعقوب نے

ان کو نبوّت اور علوم الہیٰ کی بشارت دی۔اس پیشگوئی پر حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائی ان سے حسد کرنے لگے تھے اور حضرت یوسفؑ کی جان کے خواہاں ہوگئے تھے۔ایک دن حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائی ان کو جنگل لے گئے اور ہلاک کرنے کی نیت سے ان کو اندھے کنویں میں پھینک کر گھر آگئے اور باپ سے کہہ دیا یوسف کو بھیڑیے نے ہلاک کر کے کھالیا ہے۔ جب کنویں میں گرنے سے بھی یوسف کی موت نہ ہوئی تو سوتیلے بھائیوں نے ان کو کنویں سے نکال کر مصری سوداگروں کے ہاتھ کھوٹے داموں میں فروخت کر دیا۔غالبؔ

جو چاہیئے ، نہیں، وہ مری قدر و منزلت	میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

مصری سوداگروں نے مصر لے جاکر حضرت یوسف کو غلاموں کی منڈی میں نیلام پر چڑھایا جہاں سے عزیز مصر فوطیفار نے ان کو خرید لیا۔ غالبؔ

بتو توبہ کرو، تم کیا ہو، جب ادبار آتا ہے	تو یوسف سا حسیں بکنے سر بازار آتا ہے

حضرت یوسفؑ عزیز مصر کے یہاں غلام کی حیثیت سے رہنے لگے۔عزیز مصر کی بیوی زلیخا (بہ ضم اول وفتح لام بروزن سویدا) بہت حسین و جمیل عورت تھی وہ حضرت یوسفؑ کے عشق میں مبتلا ہوگئی اور طرح طرح سے ان کو ورغلانے لگی۔زلیخا کی عشوہ طرازیوں کا حضرت یوسفؑ پر کوئی اثر نہ ہوا۔اور نہ ان کے جذبات کبھی متزلزل ہوئے۔زلیخا کا اصرار گناہ جب بڑھتا گیا تو یوسف نے اس کے ارادہ بد کو دیکھ کر ایک دن اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جس کو عزیز مصر اور زلیخا کے چچازاد بھائی نے دیکھ لیا۔زلیخا نے سارا الزام یوسف کے اوپر رکھ دیا۔حضرت یوسف کا پیراہن جب دیکھا گیا تو وہ بجائے آگے کے پیچھے سے چاک تھا جس سے زلیخا کے بہتان کی تردید ہوئی تھی۔یوسف کی بے گناہی ثابت ہوگئی مگر عزیز مصر نے اپنی بدنامی کے خوف سے ان کو زنداں میں ڈال دیا بہت دن تک قید وبند کی صعوبتیں سہنے کے بعد جب یوسف کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو فرعون مصر نے ان کو آزاد کر کے اپنے ملک کا مختار کل بنادیا۔

دوسری طرف کنعان میں حضرت یوسفؑ کے فراق میں روتے روتے حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔غالبؔ

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی	سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

اسی زمانہ میں کنعان[1] میں شدید قحط پڑا اور برادران یوسف کو غلہ لینے کے لئے مصر جانا پڑا۔ ان بھائیوں کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ عزیز مصر[2] کے روپ میں ان کا وہ بھائی ہوگا جس کو انھوں نے کھوٹے داموں میں فروخت کر دیا تھا۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا اور انھوں نے بہانہ سے اپنے والد کی خیریت معلوم کرلی۔ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو کافی غلہ دیا اور آئندہ کے لئے یہ شرط لگائی کہ وہ اپنے ساتھ اپنے بھائی بن یمن کو ضرور لائیں۔ دوسری بار جب دسوں بھائی غلہ لینے مصر گئے اپنے ساتھ بن یمین کو بھی لے گئے۔ اس بار ان لوگوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی پہچان لیا اور اپنے قصور کی معافی مانگی۔ حضرت یوسفؑ نے ان کو معاف کر دیا اور بہت سا غلہ دے کر اپنا ایک پراہن بھی دیا کہ اس کو کنعان لے جا کر باپ کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ برادران یوسف کا قافلہ جب کنعان کے قریب پہنچا تو حضرت یوسفؑ کی خوشبو باپ نے محسوس کرلی۔ غالبؔ ؎

بہر جاں پرورِن یعقوب، بال خاک سے
دام لیتے ہیں پر پرواز پیراہن کی بو

حضرت یعقوب نے اپنے رشتہ داروں سے کہا "اے خاندان یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یوسف کی مہک آرہی ہے" ان لوگوں نے حضرت یعقوبؑ کا مذاق اڑاتے ہوئے حضرت یوسفؑ کے خاتمہ پر یقین دلانے کی کوشش کی۔

برادران یوسف کا قافلہ جب بخیریت کنعان پہنچ گیا تو انھوں نے باپ کی آنکھوں پر وہ پیراہن ڈال دیا۔ اس پیراہن نے جلوۂ یوسف کی تاثیر دکھائی اور شمیم یوسف سے ان کی آنکھوں کی کھوئی ہوئی بینائی فوراً واپس آگئی۔ غالبؔ ؎

یک چمن جلوۂ یوسف ہے بہ چشم یعقوب	لالہ ہا داغ بر افگندہ و گلہا بے خار

[1] : کنعان نواح شام کا ایک چھوٹا سا موضع تھا جس میں نسل ابراہیمی کا قبیلہ آباد تھا اس موضع میں صرف حسن پوش جھونپڑیاں تھیں اور وہاں کے لوگوں کا دارومدار رزق شکار اور گلہ بانی پر تھا
غالبؔ نسیم صبح جب کنعان میں بوئے پیراہن لائی (پئے یعقوب ساتھ اپنے نوید جان وتن لائی)

[2] : عزیز مصر غالباً مصر کے وزیر اعظم کا عہدہ تھا جو فوطیفار (شوہر زلیخا) کے بعد حضرت یوسفؑ کو ملا تھا۔

تختِ سلیماں/اورنگِ سلیماں

تختِ سلیمان اور اورنگ سلیمان کی تلمیح شان و شوکت اور عظمت و جلال کے نشان کے طور پر مستعمل ہے۔غالبؔ ؎

جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفٰے
اس جگہ تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے

تختِ سلیماں بن داؤدؑ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر تھے ان کو نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں ورثے میں ملی تھیں۔ان کی حکومت نہ صرف انسانوں پر تھی بلکہ چرند پرند جن و دیو اور شیاطین بھی ان کے تابع تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں ہوا کو بھی مسخر کر دیا تھا حضرت سلیمان کا یہ تخت اجنہ کی مدد سے اڑتا تھا اور مہینوں کی مسافت منٹوں میں پوری کر لیتا تھا اس تخت کے لئے کسی انجن، مشین اور پٹرول جیسے ظاہری اسباب کی ضرورت نہ تھی بلکہ خدا کے حکم پر ایک تیز رفتار ہوائی جہاز کی مانند سبک روی کے ساتھ دوش ہوا پر اڑتا تھا۔ غالبؔ ؎

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک	اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

بیضاوی شریف میں تختِ سلیماں کے متعلق ایک اسرائیلی روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ تختِ سلیماں کو قوم جن نے بڑی کاری گری سے بنایا تھا اور وہی قوم اس کو اُڑاتی تھی۔اس تخت کے نیچے دو زبردست خوں خوار شیر کھڑے رہتے تھے۔جب حضرت سلیمانؑ اس پر سوار ہونا چاہئے تو دونوں شیر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ جاتے تھے اور وہ تخت نیچا ہو جاتا تھا جب آپ تخت پر سوار ہو جاتے تو دونوں شیر کھڑے ہو جاتے اور دو نسر (گدھ) اپنے پروں کو پھیلا کر تخت پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔

مرغاب کے میدان میں ایک چبوترے کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں ان کو بھی "تختِ سلیماں" کہا جاتا ہے۔

تختِ کَے

'کَے' کے معنی بادشاہ عالی مرتبت کے ہیں اس کی جمع کیانی ہے فردوسی نے اسلام سے قبل ایران کے چار افسانوی خاندانوں کا ذکر کیا ہے ان میں دوسرا خاندان کیانی ہے۔کیانی

بادشاہوں میں کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس اور لہراسپ وغیرہ مشہور ہیں یہ تمام بادشاہ بڑی شان وشوکت والے تھے جن کے درباروں سے زال اور رستم جیسے پہلوان وابستہ تھے اس خاندان کا دور حکومت ایران کا زریں باب کہلاتا ہے اس لئے تخت کے ایسے تخت کہتے ہیں جو صاحب جبروت بادشاہ کی ملکیت ہو۔ غالبؔ ؎

جس دل میں 'تابہ کے' سما جائے	واں عزتِ "تخت کے" نہیں ہے

تنک ظرفی منصور

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

اس شعر میں تصوف کے مسئلہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں تمام موجودات کو حق تعالیٰ کا وجود ہی سمجھا جاتا ہے ایسی بنیاد پر منصور نے نعرۂ اناالحق (میں خدا ہوں) بلند کیا تھا جس کو غالبؔ نے منصور کی تنک ظرفی سے تعبیر کیا ہے۔

منصور کا نام ابوالمغیث الحسین تھا لیکن اپنے باپ منصور البیضاوی الحلاج کے نام سے مشہور ہوا۔ منصور کی پیدائش ۲۴۴ھ مطابق ۸۵۸ء میں الطور کے مقام ابیقا (فارس) کے قریب ہوئی تھی یہ مشہور صحابی ابوایوب انصاریؓ کی نسل سے تھا۔ ۲۶۰ھ سے ۲۸۴ھ تک منصور نے صوفی بزرگوں خصوصاً حضرت بغدادیؒ سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد اشاعت سلسلہ کے لئے دنیا کے سفر وسیاحت کا آغاز کیا۔ بہت جلد ہزاروں لوگ اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے ایک روایت کے مطابق منصور نے یہ سفر طالیقان (خراسان)۔ اہواز (فارس) گجرات (ہندوستان) اور ترکستان کا کیا تھا اس کی واپسی مکہ شریف سے بغدا ۲۹۶ھ میں ہوئی تھی اس وقت تک حلاجیہ سلسلہ کے ہزاروں لوگ اس کے حلقہ میں داخل ہو کر بغداد میں موجود تھے وہاں اس نے نعرۂ اناالحق بلند کیا اور جو کچھ اس کے رگ وپے میں جلوہ گر تھا اس کا اخفانہ کر سکا۔ علماء نے اس نعرہ پر کفر کا فتویٰ لگا کر عباسی پولیس کے ہاتھوں اسے دوبار سزا دلوائی مگر وہ اپنے دعوے سے باز نہ آیا آخر بغداد کے وزیر ابن عیسیٰؒ کے حکم پر

۳۰۱ھ میں خانہ قید کر دیا گیا اور آٹھ سال تک جیل میں رہا اس کے بعد قاضی ابو عمر کے فتوے سے ۲۴؍ ذیقعدہ ۳۰۹ھ مطابق ۲۶؍ مارچ ۹۲۲ء کو پہلے منصور کو سنگسار کیا گیا پھر دار پر چڑھا کر اس کا سر کاٹ لیا گیا اور اس کی خاک کو دجلہ میں بہا دیا گیا۔ مشہور ہے کہ ہر سزا کے بعد منصور کے رگ و پے سے اناالحق کی صدا بلند ہوئی تھی۔ منصور کی ہلاکت اور سزا کی بنیاد صرف اتنی تھی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لئے مناسب الفاظ تلاش نہ کر سکا اور جن الفاظ کو اس نے استعمال کیا وہ قانون شریعت کی حدود میں آتے تھے۔ غالبؔ ؎

شہید شیوۂ منصور ہے، انداز رسوائی
مصیبت پیشگی مدعا دار و رسن لائی

حضرت ابو بکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ "ہم اور منصور ایک ہی چیز ہیں ہم دیوانہ بن کر چھوٹ گئے اور منصور کو دعوئ عقل نے برباد کیا"۔ حضرت امام غزالیؒ اور حضرت مجدد سرہندیؒ نے بھی منصور کے دعوے کی تائید کی ہے۔ حضرت فریدالدین عطارؒ کا قول ہے "جو لوگ تصوف کا دعوئ کرتے من اور منصور پر الزام لگاتے ہیں وہ رمز توحید سے واقف نہیں ہیں" بعض مسلمان مورخین نے لکھا ہے کہ منصور حلول الاھوت فی الناموت کا قائل تھا یعنی اس کا قول تھا کہ جب روح ناطقہ (خدا) کے ساتھ روح انسانی متحد ہو جاتی ہے تو اس کو مشاہدہ حق "من حیث ھو ھو" ہونے لگتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر ہر شخص اناالحق کہہ سکتا ہے بہت سے علما اور مورخین جن میں ابن اثیر اور مسعودی شامل ہیں منصور کو شعبدہ باز سمجھتے تھے جن علماء نے منصور کی تکفیر کی ہے ان میں ابن داؤد۔ ابن تیمیہ اور علامہ ذہبی شامل ہیں۔ علامہ ابوریحان البیرونی نے لکھا ہے "منصور خود کو ازلی وابدی اور خداؤں کا خدا کہتا تھا اس کے مرید اس کو تک لبادی القدیم المیر المنصور فی کل زمان" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے اور اس کو علام الغیوب کہتے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ بغداد میں منصور حلاج نام کا ایک اور زندیق گزرا ہے جو محمد ذکریا کا استاد اور ابوسعید قرسطی کا دوست تھا لوگوں نے غلط فہمی سے اس زندیق اور ملحد منصور عقائد کو ابوالمغیث الحسین بن منصور بیضاوی کے عقائد کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

تیغ اصفہانی

مرزا غالب کا شعر ہے۔

بہ گمان قطع زحمت، نہ دوچار خامشی ہو	کہ زبان سرمہ آلود، نہیں تیغ اصفہانی

اصفہان فارس کا مشہور شہر ہے جس کو فردوسی نے سپاہان لکھا ہے اور عرب اسباہان کہتے ہیں۔ یہ شہر صفوی بادشاہوں کا ہمیشہ دارالخلافہ رہا ہے قدیم روایتوں کے مطابق اس کو بہمن بن اسفندیار نے یا کیکاؤس نے آباد کیا تھا۔ یہ شہر تجارت اور صنعت میں ہمیشہ مشہور رہا ہے اسی لئے یہ قدیم کہاوت مشہور ہے کہ "اصفہان نصف جہان" شاعر اعظم خاقانی نے ساتویں صدی ہجری میں اصفہان کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا جو آج تک مشہور ہے۔ سلجوقی سلطان ملک شاہ بھی اصفہان میں رہنا پسند کرتا تھا۔ جب یہ شہر تیمور لنگ کے قبضہ میں آیا تو اس نے قتل عام میں ستر ۷۰ ہزار سروں کا منارا بنایا تھا۔ اصفہان کا تانبہ، سرمہ، زنک اور لوہے کا سامان دنیا بھر کی منڈیوں میں مقبول ہے خاص طور پر اصفہانی تلواریں۔ خنجروں اور زرہوں کی مانگ دنیا بھر میں تھی اور پرانے زمانے میں یہ سامان اصفہان کا ہی پسند کیا جاتا تھا۔

جاگیر سمندر

جاگیر سمندر سے مراد قدیم آتشکدہ ہے۔ سمندر (بروزن قلندر) دو لفظوں سے مرکب ہے سام بمعنی آگ اور اندر کلمہ ظرف ہے۔ سمندر آگ کا مشہور جانور ہے جو آگ میں جلتا نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ آگ میں سے ہی پیدا ہوتا ہے اور آگ میں ہی رہتا ہے اگر آگ سے باہر آجائے تو فوراً مر جاتا ہے۔ مشہور کہ جس جگہ ایک ہزار سال تک متواتر آگ جلتی رہے وہاں یہ جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ غالب

جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مری تحصیل	آتشکدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

سمندر کو بعض لوگ آتشی چوہا کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ گرگٹ سے مشابہہ ہے قاموس میں سمندر کے معنی طائر کے اور سمندر کے معنی حیوان کے لکھے ہیں۔ تحفہ میں لکھا ہے کہ سانپ کی شکل کا جانور ہے مگر اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں یہ بہت آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہے اس کا رنگ ابلق اور دم کوتاہ ہوتی ہے۔

ایران کے آتشکدہ میں اسلام سے قبل یہ جانور موجود تھے لوگ اس کی کھال کی ٹوپیاں بنا لیتے تھے ٹوپی میلی ہونے پر آگ میں ڈال کر صاف کر لی جاتی تھی کیونکہ اس کی کھال پر آگ کا اثر نہیں ہوتا تھالوگوں کا خیال ہے کہ سمندر بھی عنقا اور ہما کی مانند محض افسانوی جانور ہے۔

جام جم / جام جہاں نما

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی	پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

جام جم یا جام جمشید ایک مشہور افسانوی پیالہ شراب ہے جو ایران کے بادشاہ جمشید سے منسوب کیا جاتا ہے فردوسی نے جمشید کو پیشدادی سلسلہ کا چوتھا بادشاہ بتایا ہے۔

جمشید کا اصلی نام جم تھا اور شید (بمعنی شعاع) اس کا لقب تھا جو اس کے کام کا جز بن گیا ہے (اس کی تفصیل نوروز کی تلمیح میں دیکھیں) مولف چار چمن کے نزدیک جم اور سلیمان ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے لیکن پروفیسر براؤن نے ابن المقفع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان دنوں بادشاہوں میں تین ہزار سال سے زیادہ کا فرق ہے۔ شاہنامے کے مطابق جم نے سات سو سال سے زیادہ حکومت کی تھی۔ انسانوں کے علاوہ چرند و پرند اور جن و شیاطین بھی اس کے تابع تھے۔ اس کے زمانہ میں پہلی بار جنگی ہتھیار بنائے گئے۔ کاشتکاری، جہاز رانی، غوطہ خوری اور جانوروں سے کام لینے کی ابتدا ہوئی اس بادشاہ نے ہی جواہرات، عطریات، ادویات اور فلزات کا رواج دیا تھا۔ حکمائے فارس نے اس کے لئے ایک پیالہ شراب طیار کیا تھا جس کے اندر سات خط کھینچے ہوئے تھے۔ یہ سات خط تھے خط جور، خط بغداد، خط بصرہ، خط ارزق، خط شکریہ، خط اشک اور خط ساگر۔ پہلے خط تک بھری ہوئی شراب کو صرف بادشاہ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ دوسرے خط تک بھری ہوئی شراب خاندان شاہی کے لئے مخصوص تھی اسی طرح درجہ بدرجہ ہر طبقہ کے لئے ایک مخصوص خط تھا اس جام کو شاہی ضیافت کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ اس جام میں جہاں بینی کی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔

اس جام کو جام جمشید، ساغر جم اور پیمانہ جم بھی کہتے ہیں۔ غالبؔ

خانۂ تنگ ہجوم دوجہاں کیفیت	جام جمشید ہے یا قالب خشت دیوار

اور بازار سے لے آئیں گے گر ٹوٹ گیا	ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
صاف دردی کش پیمانہ جم ہیں ہم لوگ	وائے وہ بادہ کہ افسردۂ انگور نہیں

ایک پیالہ شراب کیخسرو سے بھی منسوب کیا جاتا ہے جس کو جام کسریٰ، جام کیخسرو جام جہاں نما، جام جہاں اور جام گیتی نما کہتے ہیں کمال اسمٰعیل فرماتے ہیں۔

جہاں زیر توروے تو جام کسریٰ شد	فلک زنخہ لطف تو گوے عنبر گشت

جام خسرو میں کچھ ہند سے بنے ہوئے تھے۔ جس طرح اصطرلاب سے ستاروں کا ارتفاع معلوم ہوتا ہے اسی طرح اس جام کے ہندسوں سے بھی ستاروں کی گردش مستقبل کے واقعات اور تمام عالم کے روسٹر کا پتہ چل جاتا تھا۔ غالبؔ۔

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر	سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

جبریل رجبرئیل

جبریل عبرانی لفظ ہے اس کے معنی ہیں "مرد خدا" اصطلاحاً ان چار مقرب ترین فرشتوں میں سے ایک ہے جن کے سپرد مخصوص کام ہیں۔ جبریل کا نام قرآن مجید میں تین بار آیا ہے۔ دوبار سورۂ بقر میں ایک بار سورۂ تحریم میں لیکن اس فرشتہ کی صفات کا ذکر متعدد سورتوں میں ہوا ہے۔ سورہ نحل میں اس کو 'روح القدس' سورۂ شعراء میں 'روح الامین' سورۂ الحاقہ اور تکویر میں رسول" اور دوسرے مختلف وصفی نام موجود ہیں۔ تورات اور انجیل میں بھی اس فرشتہ کا ذکر اسی حیثیت سے موجود ہے۔

قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ اور آنحضرت صلعم کے درمیان وحی کا ایلچی فرشتہ تھا۔ اسی فرشتہ نے حضرت آدم کو ابجد کی تعلیم دی اور کھیتی باڑی کا طریقہ سکھایا۔ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریقہ بتایا۔ حضرت موسیٰ کی مدد کی عبور قلزم کے وقت۔ حضرت حاجرہ کو وادی غیر ذی زرع میں تسلی دی اور زمین کا پردہ چاک کر کے چشمہ زمزم جاری کیا۔ حضرت مریمؑ کو بشارت مسیحؑ بھی جبریل نے دی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے جبریل کو اصلی شکل میں دوبار ملاحظہ فرمایا تھا۔ ایک بار معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب اور دوسری بار آسمان کے کناروں پر کھڑے ہوئے۔

مابہ میں حیتہ نام کے ایک حسین نوجوان تھے جبریل اکثر ان کی شکل میں ہی آیا کرتے تھے۔

شعلہ تحریر سے اس برق کی ہے کلکِ قضا	بال جبریل سے مسطر کش سطر زنہار

شق صدر کا واقعہ جو معراج سے قبل پیش آیا تھا اس میں جبریل نے آنحضرت صلعم کو پہلے تو خواب استراحت سے بیدار کر کے سینہ مبارک بشری آلودگیوں سے پاک کیا اور پھر اس کو ایمان و حکمت سے بھرا تھا۔ غالب ؎

دشت الفت چمن و آبلہ مہماں پرور	دل جبریل کف پاپہ ملے ہے رخسار

اس فرشتہ کے دوسرے وصفی نام یہ ہیں:۔

(۱) عقل کل، عقل اول، جوہر اول۔

حکمائے یونان نے جبریل کا شمار عقول عشرہ میں کیا ہے یعنی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات سے قبل ایک فرشتہ پیدا کیا تھا وہی فرشتہ عقل اول یعنی جبریل تھا اس فرشتہ نے پہلا آسمان بنایا اور دوسرا فرشتہ پیدا کیا۔ دوسرے فرشتہ نے دوسرا آسمان بنایا اور تیسرا فرشتہ پیدا کیا اسی طرح دس فرشتے اور نو آسمان وجود میں آئے۔ ان دس فرشتوں کو ہی یونانی فلسفہ میں عقول عشرہ کہا جاتا ہے۔

(۲) ناموس اکبر

اسرار الٰہی کا سب سے بڑا رازدار ہونے کی وجہ سے جبریل کو ناموس اکبر کہا جاتا ہے۔ آنحضرت صلعم پر جب پہلی بار وحی الٰہی کا نزول ہوا تو ورقہ بن نوفل نے اس کو ناموس کہہ کر تصدیق کی تھی۔

(۳) روح القدس

سورۂ نحل میں افضل اور برتر روح آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کہدے کہ اس روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سچائی کے ساتھ اتارا"۔ مسیحی عقدے کے مطابق بھی جبریل کو روح القدس کہا جاتا ہے اور اس کا شمار اقانیم ثلاثہ میں ہوتا ہے یعنی خدا کی اس حالت کا نام جس میں وہ روحوں کو ہدایت بخشتا ہے۔ غالب ؎

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی	روح القدس اگر چہ مرا ہمزباں نہیں

(۴) روح الامیں رجبریل امین

اللہ تعالیٰ سورۂ شعراء میں فرماتا ہے "امانت دار روح اس کو لے کر تیرے دل پر اتری تاکہ لوگوں کو خدا کے خوف سے ڈرانے والے میں سے ہو"۔

جبریل کو امانت دار روح اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ احکامات الٰہی اس کے پیغمبروں تک بغیر کسی ردّوبدل کے پہنچاتا ہے۔

(۵) سدرہ نشین مرطائر سدرہ ربلبل سدرہ۔ مرغ عرشی

جبریل کا مقام سدرۃ المنتہیٰ یعنی انتہا کی بیری کا درخت ہے یہ مقام نزول وعروج کا ہے اسی نسبت سے جبریل کو مذکورہ بالا لقب دیے جاتے ہیں۔

جلوۂ طور رتجلی طور

جلوہ کے معنی نظارہ، دیدار اور تجلی کے ہیں۔ جلوۂ طور سے مراد تجلی باری تعالیٰ ہے جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ کے اصرار پر ہوئی تھی۔

قرآنی روایت ہے کہ ایک بار بنی اسرائیل کے بے حد اصرار پر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی "رَبِّ اَرِنِی اَنظُر اِلَیکَ" یعنی اے پروردگار تو مجھے اپنے کو دکھا تا کہ میں تیری طرف نظر کر سکوں، اس درخواست کا جواب ملا "لَن تَرانِی" یعنی تو مجھے نہ دیکھ سکے گا"

حضرت موسیٰؑ کے مزید اصرار پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اچھا ان کو (بنی اسرائیل کو) بلاؤ۔ ہم اپنی تجلی کا ظہور اس پہاڑ (طور) پر کرتے ہیں اگر یہ ہماری تجلی کی تاب لایا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے" غالبؔ ۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب	آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر اپنی تجلی کا ظہور کیا تو وہ پہاڑ چشم زدن میں خاکستر ہو گیا اور ریزہ ریزہ ہو کر سرمہ سیاہ بن گیا۔ حضرت موسیٰؑ بھی تجلی کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس واقعہ کے لیے جلوہ طورؔ، برق طور، تجلی طور، جلوۂ ایمن، جلوہ سینا اور لن ترانی کی تلمیحات مستعمل ہیں۔ غالبؔ ۔

گرد جولاں سے ہے، تیری، بگریان خرام
جلوۂ طور، نمک سورۂ، زخم تکرار

کوہ طور جسے طور سینا بھی کہتے ہیں کوہ سنائی کا نام ہے۔یاقوت نے المعجم میں الطور کو عبرانی لفظ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کو "طور سینین" بھی کہا گیا ہے۔اس کی وادی کو وادی سینا،وادی ایمن اور وادی مقدس بھی کہتے ہیں کیونکہ اس وادی میں ہی حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی بخشا تھا۔اور اسی وادی میں ان کو نبوت اور رسالت سے نوازا تھا اس موقع پر ہی ان کو دو بڑے معجزے ید بیضا اور عصائے موسیٰؑ کے عطا ہوئے تھے۔اس پہاڑ کے شمالی حصہ کو اب "جبل موسیٰ" کہا جاتا ہے اور اس کے دامن کو وادی شعیب۔اس پہاڑ پر کتھرین کی خانقاہ اور جٹینین اول کا بنایا ہوا قلعہ ہے جو غالباً ۵۴۸ء میں تعمیر ہوا تھا۔

حَجر الاسود

حجر الاسود کے معنی سنگ سیاہ کے ہیں۔یہ پتھر خانہ کعبہ کے رکن شامی پر لگا ہوا ہے اور دوران حج طواف میں اس کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے جب خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی تو اس پتھر کو طواف کی جگہ متعین کرنے کے لئے لگا دیا تھا لیکن طوفان نوح میں جبریل اس کو اٹھا کر آسمان پر لے گئے تھے یا انھوں نے اس کو کوہ بو قبیس میں امانتاً رکھوا دیا تھا۔

حجر اسود کے متعلق یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پہلے یہ کتنا بڑا اور کس رنگ کا تھا اب تو کثرت مس سے اس کی سطح چکنی ہوگئی اور کافی گھس گیا ہے۔ کعبہ میں دو بار آگ لگنے کی وجہ سے اس کا رنگ بھی سیاہ ہو گیا ہے۔ ایک روایت یہ مشہور ہے کہ پہلے اس کا رنگ دودھ کی مانند سفید تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ بہشت کا لعل تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ قیامت کے دن اس کی آنکھیں اور زبان ہو جائے گی اور وہ بوسہ لینے کی شہادت دے گا یا اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے عہد نامہ روز الست محفوظ رکھوا دیا ہے قرآن مجید میں اس پتھر کا کہیں ذکر نہیں ہے اس لئے ان روایتوں کی عدم اہمیت ظاہر ہے۔اب مسلمان حج میں طواف کے موقع پر اس پتھر کو بوسہ دیتے ہیں اور اسے ازالہ معاصی سمجھتے ہیں۔غالبؔ

حجر الاسود دیوار حرم کیجئے فرض	نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے

حمزہ کا قصہ

مرزا غالب کا شعر ہے ؂

ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خون ناب	حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

اس شعر میں "حمزہ کا قصہ" کنایہ ہے طول طویل داستان اور لمبے چوڑے قصہ کی طرف جو شیطان کی آنت کی مانند دراز ہو اور اس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

'حمزہ کا قصہ' ایک فرضی داستان ہے جس میں حضرت امیر حمزہؓ بن عبدالمطلب کے افسانوی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مشہور ہے کہ شہنشاہ اکبر نے مہابھارت کے طرز پر ایک قصہ رموز حمزہ کے نام سے فارسی میں تحریر کرایا تھا جو بارہ ۱۲ دفتروں میں تھا۔ اس کا ترجمہ جب اُردو میں ہوا تو داستان امیر حمزہ' کہلایا۔

جناب راز نیر دانی رام پوری مرحوم کی جدید تحقیق یہ ہے کہ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد حکومت میں پرویز مرزا ابن فتح علی شاہ نے رموز حمزہ، کو تصنیف کیا تھا اکبر اعظم کے حکم پر علامہ فیضی نے اس قصہ کو دوبارہ لکھا۔ آئین اکبری میں بھی اس قصہ کا ذکر موجود ہے اس طرح گمان غالب یہ ہے کہ 'رموز حمزہ' قلمی شکل میں ۱۰۲۰ھ اور ۱۰۸۳ھ کے درمیان کبھی ہندوستان آیا ہو گا لیکن اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے۔ ہندوستان میں اس کا ترجمہ "داستان امیر حمزہ" اصل قصہ سے بھی بڑھ گیا ہے یہاں کے داستان گویوں نے اودھ اور رام پور کے نوابین کی سرپرستی میں اس قصہ کو اس حد تک وسعت دی ہے کہ اب اس کے چودہ ۱۴ دفتر ہیں اور ہر دفتر کئی کئی ضخیم جلدوں اور ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے داستان امیر حمزہ کی اشاعت اول مطبع نولکشور لکھنو سے انیسویں صدی میں ہوئی تھی۔
(تلمیح لقا کی ڈائری بھی دیکھیں)

حُوران خلد

مرزا غالب کا شعر ہے ؂

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
"حوران خلد" میں تیری صورت اگر ملے

حُور جمع ہے حورا کی اور احوار کی تثنیث ہے اس کے لغوی معنی "سفید" کے ہیں

اصطلاحاً گوری چٹی عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھ کی پتلی اور بال سیاہ ہوں۔ فارسی اور اردو میں یہ لفظ مفرد کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے کنایۃً شکیل و جمیل اور پری جمال عورت کو کہا جاتا ہے۔ غالبؔ ؎

ایک خون چکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

بہشت کی عورتوں کو حور کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے مختلف خصائص کا تذکرہ موجود ہے۔ سورۂ بقر میں ان کو "اَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ" (پاک وصاف بیبیاں) کہا گیا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں "قاصِرَاتُ الطَّرْفِ" (نیچی نگاہ والیاں) اور اسی سورہ میں "مَقْصُوراتٌ فِي الخِيَامِ" (خیموں میں رہنے والیاں) کہہ کر ان کا مقابلہ لولو و مرجان سے کیا گیا ہے۔ سورۂ واقعہ میں ان کو حُوْرٌ عِيْنٌ (گوری اور بڑی بڑی آنکھوں والیاں) بتایا گیا ہے۔ مفسرین نے ان حوروں کے متعلق متعدد روایتیں بیان کی ہیں جیسے ان کی خلقت مشک و عنبر سے ہوئی ہے ان کا جسم اتنا صاف وشفاف ہوتا ہے کہ ستر ستر ریشمی لبادوں میں سے بھی نظر آتا ہے وہ ہر وقت زیوارت سے لدی رہتی ہیں۔ سورۂ واقعہ میں ہے جب نیک اور پرہیز گار لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کی پیشوائی حوریں کریں گی جو حواری ہوں گی اور اپنے شوہروں کی ہم عمر ہونگی۔ غالبؔ ؎

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

خاتم جمشید

جمشید ایران کے پیشدادی سلسلہ کا چوتھا بادشاہ تھا لیکن اہل ایران عام طور پر حضرت سلیمان بن دواؤدؑ کو ہی جمشید سمجھتے ہیں اور تمام ہنجامنشی کتبات کو ان کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔ اس بات کی بظاہر وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان دونوں بادشاہوں سے جو عظیم الشان اور دیو ہیکل عمارتیں منسوب ہیں ان کی تعمیر انسانی ہاتھوں کی نہیں معلوم ہوتی

ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ان عمارتوں کو جنّات نے تعمیر کیا تھا۔ قدیم تاریخ میں صرف حضرت سلیمانؑ ہی ایسے بادشاہ گزرے ہیں جن کی حکومت انسانوں کے علاوہ دیو، جن، چرند، پرند اور دوسرے تمام مخلوقات پر بھی تھی۔ اس لئے جب جمشید کے ساتھ خاتم، نگیں، مہریا انگشتری کا سابقہ آئے تو اس سے مراد حضرت سلیمان سے ہی ہوتی ہے (مہر سلیمان کی تلمیح بھی دیکھیں) غالبؔ ۔

سلطنت دست بہ دست آئی ہے	جام مۓ - خاتم جمشید نہیں

خامۂ مانی

مرزا غالبؔ کا شعر ہے۔

زلف تحریر پریشانِ تقاضا ہے مگر	شانہ سہاں مو بہ زباں، خامۂ مانی مانگے

اس شعر میں خامہ مانی کا اشارہ مشہور مصور اور نقاش مانی کے قلم کی طرف ہے مانی کا اصل نام "توزیقوس" تھا یہ بابل کے ایک گاؤں میں حضرت عیسیٰؑ کے بعد پیدا ہوا تھا اس کے زمانۂ پیدائش میں اختلاف ہے کوئی تو اس کو اُردشیر کا ہمعصر بتاتا ہے اور کسی کے نزدیک وہ بہرام شاہ بن ہرمز شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ قدیم ماخذوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاپور کی تاج پوشی ۲۴۲ء میں ہوئی تھی اور مانی کا پہلا وعظ بھی اسی جشن تاجپوشی کے دن یکم نیساں کو ہوا تھا جب کہ آفتاب برج حمل میں تھا اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ تاریخ ۲۰؍ مارچ ۲۴۲ء کی ہونا چاہیے اس طرح مانی کی پیدائش ۲۱۵ء کے لگ بھگ ہونا چاہیے کیونکہ اس نے پہلا وعظ ۲۵۔ ۲۶ سال کی عمر میں دیا تھا۔ مانی کا مذہب شروع میں مغتسلہ تھا جب ایک فرشتہ "توم" نے اس کو حقائق ربانی سے آگاہ کیا تو اس نے خود کو 'فارقلیط' ظاہر کر کے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ سابقہ مذاہب کے اکمال کے لئے مبعوث ہوا ہے اور وہ "خاتم النبین" ہونے کا دعویدار تھا۔ مانی نے مسیحی مذہب اور دین زرتشتی کے امتزاج سے جو نیا مذہب ایجاد کیا وہ 'فرقہ مانویہ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے سریانی زبان میں متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں ان کے نام مشرقی اور مغربی ماخذوں میں دے گئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ (۱) کتاب الاسرار (مذہبی تعلیم پر مباحثہ) (۲) کتاب الاثنین (رزمیہ کہانیاں اور آسمان پر دیووں کے حملہ کا احوال) (۳) کنز الحیاۃ (انجیل سے ملحق فلسفہ عرفان)

(۴) انجیل زندہ (علم باطن پر مشتمل مضامین) (۵) کتاب المواعظ (قواعد اخلاق) (۶) شاپورگان (مسئلہ معاد پر پہلوی زبان کی کتاب شاپور اور کے نام معنون)

مسلمان مورخین نے مانؔی کے متعلق حیرت انگیز واقعات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو خطاطی اور مصوری میں یہ طولیٰ حاصل تھا اور اس نے اس فن کو اپنی تعمیری کا معجزہ قرار دیا تھا۔ فردوسؔی نے لکھا ہے کہ مانی چین سے آیا تھا اور مصوری میں بھی اس کا جواب نہ تھا چنانچہ ان کا قول ہے۔

بیامد یکے مرد گویا زچین	کہ چوں اُو مصور نبیند زمین

مانؔی کا نام مصوری کی وجہ سے ہی زندہ ہے اور اسی حیثیت سے شعرا نے تلمیحاً استعمال کیا ہے۔ غالبؔ ۔

کھینچے گرمائی اندیشہ چمن کی تصویر	سبز مثل خط نو خیز ہو خط پرکار
جس کے حیرت کدۂ نقش قدم میں مانی	خون صد برق سے باندھے بہ کف دست نگار

مانی کا اژنگ بھی دنیا میں مشہور ہے۔ فارسی میں ارژنگ یا ارتنگ دراصل اردنگ کا مفرس ہے اس کے لغوی معنی نگار خانے (پکچر گیلری) کے ہیں۔ اسی طرح جب نگار خانہ چین یا ارژنگ چین کہتے ہیں تو اس سے مراد ارژنگ مانی ہی ہوتا ہے۔ مشہور مورخ اور ہیئت دان ابوالمعالی اپنی کتاب "بیان الادیان" (مصنفہ ۴۸۵ھ) میں لکھتے ہیں کہ مانی کی کتاب التصاویر (البم) کا نام ارژنگ مانی تھا جب کہ صاحب روضۃ الصفا نے مانؔی کے سجائے ہوئے ایک غار کو ارژنگ قرار دیا ہے۔ پروفیسر الفرک کے نزدیک ارژنگ مانی درحقیقت مانؔی کی انجیل کے باتصویر نسخہ کا نام تھا اس کی تصدیق ابوالمعالی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

ابولمعالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے زمانہ تک ارژنگ کا قلمی نسخہ غزنی کے کتب خانہ میں موجود تھا عام طور پر یہی مشہور ہے کہ مانی چین کا رہنے والا تھا اس لیے صورت گر چین، نقاش چین اور بتخانہ چین کی تلمیحات بھی مانؔی کے لئے ہی مستعمل ہیں۔ غالبؔ ۔

جلوۂ برق سے ہو جائے نگہ عکس پذیر	اگر آئینہ بنے حیرت صورت گر چین
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے	رنگ عاشق کی طرح رونق بتخانہ چین

خطِ خامۂ بہزاد

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

گر بہ بزمِ باغ کھینچے، نقشِ روئے یار کو	شمع ساں ہو جائے خطِ خامۂ بہزاد گل

بہزاد کے معنی نیکو زادہ کے ہیں۔ یہ مشہور و معروف ایرانی نقاش اور مصور، کمال الدین کا لقب ہے جو ۸۴۴ھ سے ۸۵۵ھ کے درمیان ہرات میں پیدا ہوا اور ۹۴۰ھ میں فوت ہوا۔ اس طرح بہزاد کا زمانہ عہد تیموری کے آخری دور سے صفوی زمانہ کے شروع تک رہا۔ شروع میں وہ سلطان حسین مرزا (۸۷۴۔ ۹۱۲ء) کے دربار سے وابستہ رہا۔ اسی بادشاہ کے مشہور و معروف وزیر علی شیر نوائی تھے اس کے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی (۹۰۶۔ ۹۳۰ء) نے بہزاد کو ہرات سے تبریز طلب کیا تھا جہاں وہ شاہ طہماس اول تک زندہ رہا۔ بہزاد کے شاگردوں میں بادشاہ، شاہزادے اور بڑے بڑے لوگ شامل تھے۔ ان میں شیخ زادہ خراسانی، میر مصور سلطانیہ اور آغا میر تبریزی مشہور مصور گزرے ہیں ان مصوروں نے ہرات کے شاہی محل کو تصادیر سے مزین کیا تھا۔ ایک شاگرد مظفر علی نے چہل ستون کو مصور کیا تھا۔ بہزاد کی مصوری کے متعلق بہت سے قصے اور واقعات مشہور ہیں جن میں سے بیشتر کی اصلیت موردِ تردید ہے۔ مشہور ہے کہ ایک بار بہزاد نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر کپڑے کے ایک تھان پر خط کھینچا تھا جب اس تھان کو غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پورا خط ایک ہی تار پر کھینچا ہوا تھا۔ بہزاد نے جن کتابوں کو مصور کیا تھا ان میں سلطان علی مشہدی کا تیمور نامہ مشہور ہے جو اکبر اعظم کے کتب خانہ میں موجود تھی اس نے شیخ سعدیؒ کی مشہور کتاب "بوستان" (۸۹۳ھ) کو بھی مصور کیا تھا جو اب بھی قاہرہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ غالبؔ ۔

بہزاد نقش یک دل صد چاک عرض کر
گر زلفِ یار کھینچ نہ سکے شان کھینچے

چراغانِ دوالی

دوالی ہندوستان کا مشہور تہوار ہے۔ جو جشن چراغاں کی وجہ سے "دیپ والی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تہوار ہر سال کارتک کے مہینہ کی پندرہ تاریخ کو منایا جاتا ہے۔

اس دن آفتاب اور ماہتاب کا برج میزان میں اجتماع ہوتا ہے۔ لوگ غسل و آرائش کر کے قسمت اور دولت کی دیوی لکشمی کی پوجا کرتے ہیں مکانوں اور دکانوں کو سجاتے ہیں اور روشنی کرتے ہیں۔ اس دن لکشمی نے بیر و جن کے بیٹے بل کو پاتال کی قید سے چھڑایا تھا اس لئے "یوم بلراج" بھی کہتے ہیں۔ غالب ؎

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ، ہر اک عضو تن	جوں چراغانِ دوالی صف بہ صف جلتا ہوں میں

دستِ موسیٰ

دست موسیٰ کی تلمیح حضرت موسیٰ کے معجزہ ید بیضا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

حضرت موسیٰ نبی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کی پیدائش فرعون مصر منفتاح بن ریمیسس ثانی (۱۲۹۲۔۱۲۲۵ ق م) کے زمانہ میں ہوئی تھی اس زمانہ میں سحر و ساحری کا مصر میں بہت زور تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزے عطا کیے تھے جن کے سامنے ساحرین مصر بھی عاجز ہو جائیں۔ ان معجزوں میں سے ہی ایک ید بیضا یعنی دست سفید کا معجزہ تھا جو ان کو نبوت کے ساتھ عطا ہوا تھا۔ حکیم خاقانی کا شعر ہے ؎

بر آور ز جیب فلک دست موسیٰ	زر سامری نقد میزان نماید

حضرت موسیٰ کے زمانہ طفولیت میں ایک بار فرعون مصر نے ایک طشت میں کھجوریں اور دوسرے میں دہکتے ہوئے انگارے رکھ کہ حضرت موسیٰ کا امتحان لیا تھا کیونکہ اس کو یہ شبہ ہو گیا تھا۔ کہ یہ بچہ عام بچوں سے مختلف ہے اور اس کی حکومت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر معصومیت طفل ہی ظاہر کرانا مناسب سمجھا اس لئے حضرت موسیٰ نے دہکتا ہوا انگارا اٹھا کر منھ میں رکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کی زبان میں لکنت آگئی جو ساری عمر رہی اور ہتھیلی پر آگ کا سفید داغ پڑ گیا۔ حضرت موسیٰ کو جب منصب نبوت عطا کیا گیا تو ان کا یہ داغ معجزۂ ید بیضا میں تبدیل ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو گریبان میں لے جا کر بغل سے کر کے جب بھی باہر نکالتے تو ان کی ہتھیلی آفتاب کی مانند چمکنے لگتی تھی اور پیغام حق کے لئے دلیل و حجت کا کام دیتی تھی۔ اس معجزے کو دیکھ کر ساحرین مصر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ بلا شبہ یہ طاقت بشری دسترس اور انسانی صنعتوں سے بلند و بالا ہے۔ غالب ؎

حسن آشفتگیٔ جلوہ ہے عرض اعجاز	دست موسیٰ بسر دعویٰ باطل باندھا

دوزخ اور بہشت

مرزا غالب کا شعر ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

دوزخ تحت الثریٰ کے ان سات طبقوں کو کہا جاتا ہے جہاں گنہگاروں کو عذاب الحریق یعنی جلنے کا عذاب دیا جاتا ہے۔ بہشت کے معنی باغ۔ جنت اور آرام کے مقام کے ہیں۔ یہ نعمتوں اور مسرتوں کا دائمی گھر ہے جو اللہ تعالیٰ نے نیکوکار انسانوں کے لئے بنایا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں قیامت اور جزائے اعمال کا عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے موجود ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔"اُس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہے وہ اس کو بھی دیکھ لے گا"(سورۂ زلزال۔ا)

اسلام میں ہر گناہ کا لازمی نتیجہ عقاب اور اعمال صالحہ کا پھل ثواب بتایا گیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب (یعنی پیچھے) سے نکلا ہے یہ اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آتا ہے ثواب کا ماخذ یعنی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف آیتوں میں اپنا یہ منشا ظاہر کیا ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی عطا کی جائیں گی مگر ان کی بنیاد اعمال نیک کا حصول اور اعمال بد سے پرہیز ہے۔ موت اور حساب کتاب کے بعد جس مقام پر بہ مسرت دوام حاصل ہوتی ہے۔ اس کو ہی بہشت کہتے ہیں اور وہ مقام جہاں پہنچ کر دنیاوی کوتاہیوں کی تلافی اور اعمال بد سے پاک ہونے کا عمل ہو گا اس کو دوزخ کہتے ہیں۔

دوزخ میں گنہگاروں کو جلنے کا شدید عذاب دیا جاتا ہے اور عذاب انسانی گناہوں کے نتائج بد کا نام ہے۔ یہ عذاب آتش دوزخ اور اس کے شدید آلام کی شکل میں ہو گا۔ دوزخ کے سات طبقوں کے نام ان کے عذاب شدت کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں جیسے جہنم (چاہ عمیق) عام لوگوں اور اہل کبائر کا مقام جو بے توبہ مر گئے ہوں۔ نطی۔ ستارہ پرستوں کا مسکن۔ حطمہ (آتش قوی) بت پرستوں کا مسکن۔ سعیر (آتش افروختہ) ابلیس اور متابعان ابلیس کا مکان۔ سقر مقام ترسایان۔ جحیم، مشرکوں کا مقام۔ ہادیہ۔ منزل منافقاں۔ زنادقہ

وکفار۔ان ساتوں طبقوں میں آگ کے علاوہ سانپ۔ بچھو اور ہر قسم کی بلائیں ہوں گی جن کی تفصیل مفسرین نے دی ہے۔ دوزخ کا ایک مقولہ "ہل من مزید" (کچھ اور ہے) بھی تلمیحاً مستعمل ہے قیامت کے دن جب تمام دوزخی دوزخ میں جا چکے ہوں گے تو دوزخ پکار پکار کر مذکورہ بالا جملہ کہے گا۔غالبؔ۔

جان مطرب "ترانہ ہل من مزید" ہے	لب پر وہ سنج زمزمہ الاماں نہیں

بہشت اور جنت انسان کا موروثی اور دائمی مقام ہے جس میں ہر قسم کی لذتیں اور مسرتیں نیک انسانوں کو حاصل ہوں گی جن کا لطف دائرۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا ہے۔ وہاں کوئی بھی روحانی یا جسمانی آزار نہ ہوگا۔ خوف و غم، رشک وحسد اور فکر و پریشانی کا نام ونشان بھی نہ ہوگا وہ مقام راحت وسکون ہے جہاں ہر طرف نور ہی نور ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل اور حمد ثنا کرنا ہی انسان کا کام ہوگا ان سب سے بڑی نعمت قرب باری تعالیٰ ہے جو وہاں میسر ہوگا۔ آخری اور سب سے بڑی نعمت دیدار باری تعالیٰ ہے جس سے جنت کے لوگ مشرف ہوں گے۔ایسے مقام کے لئے قرآن مجید میں عام طور پر جنت ہی کہا گیا ہے لیکن بعض مقام پر اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے جیسے جنت الخلد (بقائے دوام کا گھر)۔ جنت عدن (دائمی سکونت کا باغ) اور جنت الماویٰ (پناہ کا باغ) اس کے علاوہ جنت کو دوسرے ناموں سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جیسے فردوس (باغ)۔ روضہ (چمن) دارالخلد (ہمیشگی کا گھر)۔ دارالمقام (قیام کا گھر)۔ دارالسرور (خوشی کا گھر) دارالقرار (سکون و آرام کا گھر) دارالسلام (امن و سلامتی کا گھر) اور دارالنعیم (نعمتوں کا گھر) وغیرہ۔

ذوالفقار شۂ مرداں

(بہ فتح فا صحیح اور بہ کسر غلط ہے) اس کے معنی ہیں مہرہائے پشت والا۔ یہ اس تلوار کا نام ہے جو آنحضرت صلعم کو معرکۂ بدر میں عاص بن منبہ سے ہاتھ آئی تھی۔ اس تلوار پر فقار یعنی مہرہائے پشت از گردن تا کمر کی مانند نشان تھے یا اس کی سطح عدیم الارتفاع تھی۔ اسی لئے اس تلوار کو "سیف مفقر" بھی کہتے ہیں۔ یہ روایت یہ بھی ہے کہ اس کی دو زبانیں تھیں اور یہی روایت زیادہ مشہور ہے۔ عرب میں دو زبانوں والی تلوار کا زمانہ قدیم میں رواج تھا۔ غالبؔ۔

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو	پر ہیں یہ دونوں یا رایک
وضع میں گو ہوئی دوسر	تیغ ہے ذوالفقار ایک

ذوالفقار کے فضائل اور خصائص پر متعدد احادیث موجود ہیں۔ شمائل شریف میں، باب الیسوف النبیؐ، میں اس تلوار کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ عباسی خلفا تک یہ تلوار محفوظ تھی۔ آنخضرت صلعم نے یہ تلوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بخش دی تھی اسی لئے حضرت علی کو صاحب ذوالفقار بھی کہا جاتا ہے۔ شاہ مرداں (سردار دلاوران صف شکن) بھی حضرت کرم اللہ وجہہ کا لقب ہے اس لئے اس تلوار کو ذوالفقار شہ مرداں بھی کہتے ہیں۔ غالبؔ ؎

موج طوفان غضب، چشمہ نہ چرخ حباب	ذوالفقار شہ مرداں، خط قدرت آثار

ذوالفقار کے متعلق مسلمانوں میں بہت سی ضرب المثلیں اور روایتیں مشہور ہیں جیسے "لافتیٰ الاّ علی۔ لاسیف الا ذوالفقار"۔ ایک دستک بھی عام طور پر رائج ہے "موش۔ مار۔ خوار۔ بہ ذوالفقار علی گرفتار"

ذوق کعبتین

ذوق کعبتین سے مراد ہے جوئے کا شوق۔ قمار بازی کی لت۔ کعب (بالفتح) شتالنگ یعنی استخوان مربع کو کہتے ہیں اس لئے کعبتین سے مراد دو مربع شش پہلو پانسے ہیں جو عام طور پر ہڈی، ہاتھی دانت یا پلاسٹک کے ہوتے ہیں ان پانسوں کے ہر پہلو میں بندکیاں (خال) پڑی ہوتی ہیں۔ کعبتین کو عوام کا بتین کہتے ہیں۔ ان پانسوں سے چوسر یا پچیسی کھیلی جاتی ہے۔ غالبؔ ؎

بسمل اس تیغ دو دستی یکا نہیں بچتا، اسد
عاقبت بیزار، ذوق کعبتین اچھا نہیں

یہ پانسے ہار جیت کا دانو ڈالنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں اور ان کی عددی مقدار سے چال چلی جاتی ہے۔ کعب کے چھ پہلو بندکیوں کی تعداد کے حساب سے چھکا، پنجا، چوک۔ تری۔ دوّا اور پو کہلاتے ہیں۔

والہ ہردی فرماتے ہیں ؎

منداز کعبتین و غل در بساط حسن	در نرد عشق برد حریفے کہ باخت پاک

رابطۂ قربِ کلیم اور مائدہ بذلِ خلیل

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم	تجھ سے دنیا میں بچھا مایدۂ بذلِ خلیل

یہ دونوں تلمیحات عصائے موسیٰ اور خوانِ خلیلؑ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کلیم (کلام کرنے والا) حضرت موسیٰ کا لقب ہے کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شرف ہم کلامی بخشا تھا اور خلیل (دوست) حضرت ابراہیم کا لقب ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی مہمان نوازی،۔ وسعت دستر خوان،۔ اخلاق کریمانہ، استقلال عزم واستقامت اور تسلیم ورضا کی وجہ سے عطا کیا تھا۔ اس تلمیح میں مائدہ کے معنی کھانا لگے دستر خوان کے ہیں اور بذل کے معنی عطا و بخشش کے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے وادی یمن میں سب سے پہلے ندائے الٰہی سنی تھی اور پھر لذت ہمکلامی سے نوازے گئے (جلوہ طور اور نخل طور کی تلمیحات بھی دیکھیں) اس سے قبل یہ اعزاز کسی اور نبی کو نہ بخشا گیا تھا اس ہمکلامی اور گفتگو کے طول کا رابطہ بھی عجیب تھا یعنی بکریاں چرانے کی ایک معمولی لاٹھی حضرت موسیٰ کو قرب الٰہی نے اس درجہ وارفتہ اور مسکت کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ کلام کا آغاز اس طرح کیا کہ موسیٰ کو کچھ ہوش آجائے۔ اللہ تعالیٰ کا پہلا سوال یہ تھا" اے موسیٰ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے"؟ گویا یہ تمہید تھی موسیٰ کی گنگ زبان کھلوانے اور ان کی وارفتگی کم کرنے کی۔ انھوں نے عرض کیا " یہ میری لاٹھی ہے" اتنا ہی جواب کافی تھا مگر وہ وفور جذبات سے بے قابو ہو کر اس لاٹھی کی افادیت بھی بیان کرنے لگے "بکریاں چراتے وقت میں اس (لاٹھی) کا سہارا لیتا ہوں اور (اس سے) بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اس جملہ کے بعد ان کا ارادہ ہوا کہ اس لاٹھی کے مزید فائدے بیان کریں لیکن یکایک ان کو ہوش آگیا اور محبوب حقیقی کا پاس ادب مانع آیا اور دل میں کچھ سوچ کر جلدی سے اپنا جملہ اس طرح ختم کیا "اور میرے لئے اس سے متعلق اور بھی ضروریات ہیں"۔ یہ اور بھی نادانستہ طول بیانی تھی مگر اللہ تعالیٰ کو پسند آرہی تھی۔ اس طرح ایک ادنیٰ اور معمولی لاٹھی قرب الٰہی کا ذریعہ اور رابطہ بنی ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ (اللہ کے دوست) کی مہمان نوازی نے ضرب المثل کی

شکل اختیار کرلی ہے۔ اس سلسلہ میں "خوانِ خلیل" کی تلمیح مشہور ہے حضرت ابراہیم کا معمول تھا کہ بغیر مہمان کے کھانا تناول نہیں فرماتے تھے اگر اتفاق سے کوئی مہمان نہ ہو تو اس دن آپ فاقہ سے رہتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ مہمان کی تلاش میں جنگل میں کھڑے تھے کہ ایک بوڑھا مل گیا۔ اس بوڑھے کو اپنے گھر لا کر کھانا کھلایا اور کھانے کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور بوڑھے سے بھی شکر ادا کرنے کو کہا۔ وہ بوڑھا بُت پرست تھا۔ خدائے واحد کا نام سن کر اس کو غصہ آگیا اس نے جواب دیا "میں تیرے رب کو نہیں جانتا کہ کون ہے۔ میں تو اپنے معبود کا شکر گزار ہوں جو میرے گھر کے طاق میں رکھا ہے"۔ حضرت ابراہیم کو بوڑھے کے یہ الفاظ حد درجہ ناگوار گزرے اور انھوں نے خشمناک ہو کر اس مشرک بوڑھے کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس کے فوراً بعد حضرت ابراہیم کو اپنے اس طرزِ عمل پر تکدر رہوا۔ انھوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا میں اس سے شکر ادا کرنا چاہتا تھا وہ تو اتنا رحیم و کریم ہے کہ اپنی نعمتوں سے بوڑھے کو برابر نواز رہا ہے اور اس کے شرک سے ناراض ایک وقت کا رزق بھی اس پر بند نہ کیا پھر مجھے کیا حق تھا کہ اس کو گھر سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ نے اس طرزِ عمل کی تلافی کی۔ غرض کہ یہ تھے وہ اوصافِ حمیدہ جو اللہ تعالیٰ کو پسند تھے اور جن کی وجہ سے وہ خلیل کے لقب سے ممتاز کیے گئے تھے۔

راجہ اندر کا اکھاڑا

راجہ اندر کا اکھاڑا کنایۃً ایسی مجلس کو کہتے ہیں جہاں پری جمالوں کا مجمع اور حسینوں کا ہجوم و اژدہام ہو اور جہاں بہت سے اربابِ نشاط جمع ہوں۔ راجہ اندر کے دربار کو ڈرامہ کی صورت میں بھی دکھایا جاتا ہے جس کو "اندر سبھا" کہتے ہیں اُردو میں امانت لکھنوی کی اندر سبھا مشہور ہے ایسے ڈراموں میں دیووں اور پریوں کے ناچ دکھائے جاتے ہیں۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے	ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظر گاہ اہلِ وہم و خیال	یہ ضیا بخش چشمِ اہلِ یقین
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم	کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے	ژالہ آسا بچھے ہیں دُر نمیں
نغمہ مطربان زہرہ نوا	جلوۂ لولیان ماہ جبیں

اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون

واں وہ دیکھا یہ چشم صورت بیں

اندر کے لغوی معنی صاحب فرہنگ آصفیہ نے چترائی اور چالاکی کے لکھے ہیں۔ ہندو دیومالا کے مطابق اندر ایک پُرانک دیوتا کا نام ہے جس کا درجہ برھما، وشنو کے بعد سب سے اونچا ہے اسی وجہ سے اس کو "دیوراج" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ آسمان، ہوا، بادل، سورگ (بہشت) اور اپسراؤں (حوروں) کا مالک ہے ویدوں کی بہت سی رچنائیں اس سے منسوب ہیں۔ سمند منتھن کے نتیجہ میں نکلنے والے چودہ رتنوں میں سے تین رتن یعنی اراوت (ہاتھی) اچے شروا (گھوڑا) اور پریجات ورکش اس کے حصہ میں آئے تھے۔ اندر کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں جیسے میگھ ناد سے لڑائی، سندر اور اُپ سندر کا سورگ پر حملہ۔ تلوتما کی تخلیق اور گوتم کی بیوی اہلیا کا قصہ وغیرہ وغیرہ۔

اندر کا رنگ کندن کی مانند سہنرا و سرخ اور بازو لمبے لمبے ہیں۔ وہ جو شکل چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے اس کی سواری کا رتھ چمکیلا ہے ۔ جس میں دو سرخ گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ اس کا خاص ہتھیار بجر ہے۔ کمان اور جال بھی ساتھ رہتا ہے ہواؤں کا مالک ہونے کی وجہ سے موسموں اور بارش کا انتظام، رعد و برق کی ماموری اور زمینوں کی سرسبزی اس کے کام ہیں۔ اس کے دارالحکومت کا نام امراوتی اور رتھ کا نام ویان ہے۔

رستم و سام

مرزا غالب کا شعر ہے۔

بزم میں میزبان قیصر و جم	رزم میں اوستاد رستم و سام

رستم[1] و سام ایران کے دو مشہور پہلوانوں کے نام ہیں۔ شاہنامہ فردوسی کے علاوہ ان دونوں پہلوانوں کا ذکر ایران کے قدیم قومی افسانوں اور ادب میں موجود نہیں ہے۔ مذہبی

---

[1] رستم کا شجرہ جان مالکم نے اس طرح لکھا ہے۔ رستم زال بن سام تریمان بن گرشاسپ بن ارتوت بن جمشید۔

کتاب اوستا بھی ان کے ذکر سے خالی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فردوسی کے ذہن کی پیداوار ہیں لیکن نویں صدی عیسوی کے مشہور ارمنی مورخ موسیٰ خورینوی نے ان پہلوانوں کے وجود کا اظہار کیا تھا اور عرب حملہ آوروں کو سیستان کا وہ اصطبل بھی دکھایا تھا جہاں رستم کا گھوڑا رخش باندھا جاتا ہے۔

شاہنامہ فردوسی کے مطابق رستم اور اس کے اجداد سے نہ صرف ایران کا قومی افسانہ بلکہ تاریخ ایران کا ایک بڑا حصہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ پہلوان سینکڑوں سال تک ایرانی سلطنت کے صلاح کار مشیر اور سپہ سالار رہے اور شاہان کیان بالخصوص کیقباد، کیکاؤس اور کیخسرو کے مددگار و جان نثار رہے فریدوں نے مرتے وقت اپنے بیٹے منوچہر کو وصیت کی تھی کہ وہ سام بن نریمان (رستم کا دادا) کے مشورے پر چلے کیونکہ وہ سیستان کا موروثی شاہزادہ، بڑا عالی خاندان اور عقیل و فہیم ہے۔ منوچہر نے سام کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ سام کا بڑا بیٹا زال اس طرح پیدا ہوا تھا کہ اس کے سارے بال سفید تھے۔ زال کے بیٹے کا نام رستم تھا اگر یہ تینوں پہلوان نہ ہوتے تو ایران پر والی توران افراسیاب قابض ہو جاتا۔ ان پہلوانوں نے متعدد بار افراسیاب کو شکست دی اور توران پر قبضہ کر کے اسے تہس نہس کیا۔

رستم کبھی کسی سے زیر نہ ہوا تھا اس نے جس ملک پر فوج کشی کی اس کو حاصل کر کے چھوڑا اس کی آخری جنگ اپنے ہی ولی نعمت کے باغی بیٹے اسفندیار روئیں تن سے ہوئی تھی جب وہ بہت مجبور اور مجروح ہوا تھا لیکن آخرکار اسفندیار کے بھی اس کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ اتنی جاں نثاریوں کے بعد بھی ایران کے بادشاہ ہمیشہ ان پہلوانوں سے خوف زدہ اور بدظن رہے۔ کیکاؤس کی سازش سے ہی رستم نے نادانستگی میں اپنے اکلوتے بیٹے سہراب کو بے گناہ قتل کر دیا تھا۔ جب سہراب کے لئے نوشدارو کی ضرورت ہوئی تو یہ دوا رستم کو نہ مل سکی حالانکہ وہ کیکاؤس کے پاس موجود تھی۔ رستم کے سوتیلے بھائی کی سازش سے رستم خس پوش کنویں میں گر کر ہلاک ہوا اس وقت رستم کی عمر ۱۱۱۳ سال کی تھی اور اس کا باپ زال[1] زندہ تھا۔

---

1 زال کے لغوی معنی سفید بالوں والے بوڑھے کے ہیں۔ زال جب پیدا ہوا تو سام نے اس کو کوہ البرز پر اس لئے پھنکوا دیا تھا کہ وہ دیووں کی اولاد ہے۔ وہاں سیمرغ نے زال کی پرورش کی۔ کچھ مدت کے بعد جب سام نے زال کو بلالیا تو بزرجمہر نے اس کو کابل کا حکمراں بنا دیا تھا۔ زال کی شادی مہراب شاہ کابلی کی بیٹی رودابہ سے ہوئی تھی جس کے بطن سے رستم پیدا ہوا۔ زال کی عمر بے حد و بے قیاس ہوئی تھی۔)

رنگ بہار ایجادیٔ بیدل

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؂

اسد ہر جا سخن نے طرح ڈالی باغ تازہ کی	مجھے رنگ بار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

اس تلمیح کا اشارہ مرزا عبدالقادر بیدلؔ کی جدت طرازی، مشکل پسندی نکتہ شناسی اور انفرادیت کی طرف ہے۔ بیدل کا منفرد انداز بیان ان کو ہمعصر شعرا میں ممتاز کرتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے بھی بیدلؔ کا تتبع کیا تھا چنانچہ وہ اپنے ایک شاگرد مولوی عبدالرزاق کے خط میں میں لکھتے ہیں۔

"قبلہ! ابتدائے فکر سخن میں بیدلؔ و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا" (عود ہندی ص ۱۵۹) اس بات کا اعتراف انھوں نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؂

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب	ساز پر رشتہ پئے نغمہ بیدل باندھا

بیدل کی تقلید میں دشواری کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؂

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا	اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا شمار ہندوستانی شعرا (فارسی) کی صف اوّل میں ہوتا ہے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں "چہار عنصر" بیحد مقبول اور مشہور ہے۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ بھی شاعری میں بیدلؔ سے مشورہ لیتے تھے۔ بیدلؔ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کر دیتے تھے۔ ان کی شاعری تخیل کی شاعری تھی اور بلند تھی اس لئے اسلوب بیان میں پیچیدگی پائی جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے لیے جدید اسلوب بیان اختیار کیا تھا۔ نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں اختراع کی تھیں۔ وہ بہت آسانی سے اپنے مدعائے دشوار کا اظہار کر دیتے تھے مثلاً کنہہ حقیقت کے بارے میں متعدد شعرا نے لکھا ہے مگر بیدل کا انداز بیان اچھوتا، منفرد، مربوط اور دلنشین ہے فرماتے ہیں ؂

تمام شوقیم لیکن غافل کہ دل براہ کہ می خرام

جگر بہ داغ کہ می نشیند، نفس بہ آہ کہ می خرامد

بیدل کی پیدائش ۱۰۵۴ھ میں ہوئی اور ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی ساری زندگی دہلی میں گزری تھی۔ بیدلؔ کے مولد و منشا کے تعین میں بھی اختلاف ہے۔ شاد عظیم آبادی نے تاریخ صوبہ بہار" (۱۸۸۰ء) میں لکھا ہے کہ وہ پٹنہ کے متوطن تھے مگر وطن چھوڑ کر بہ عہد شاہجہاں دہلی چلے گئے تھے اور وہاں نہایت معزز و مکرم ہوئے۔ بندرابن خوش گو نے اپنے تذکرہ "سفینۂ خوشگو" میں ان کو اکبر آبادی لکھا ہے جب کہ حکیم قدرت اللہ قاسم نے تذکرہ "مجموعۂ نغز" (۱۲۲۱ھ) میں بیدلؔ کا وطن اور مولد بخارا قرار دیا ہے۔ تذکرہ ریاض العارفین میں ان کا وطن دہلی لکھا ہے بیدل کے باپ عبدالخالق ترکی کے مشہور قبیلۂ برلاس سے تعلق رکھتے تھے اور قادری سلسلہ کے صاحب ارشاد بزرگ تھے۔ بیدل کے نام سے اس عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

رودِ نیل

رودِ نیل سے مراد مصر کا مشہور دریائے نیل ہے۔ جس کی وجہ سے مصر ایک زرخیز ملک ہے اگر یہ دریا نہ ہوتا تو مصر ایک ریگستان بن گیا ہوتا۔ مصر کے قدیم باشندے اس دریا کو اپنا معبود سمجھتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔ یہ ان دریاؤں میں سے ہے جو اسلامی ملکیت میں شروع سے رہے ہیں۔

قدیم عربی لٹریچر میں نیل اور نیل مصر کا ذکر موجود ہے حالانکہ یہ نام قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اَلْیَمُّ (طٰہٰ۔ ۲۰۔ ۲۹) کا ذکر ہے جس سے دریائے نیل ہی مراد ہے کیونکہ یَمّ بڑی ندی یا دریا کو کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کو زمانہ شیر خوارگی میں صندوق میں بند کر کے الیمّ میں ڈالا گیا تھا وہ دریائے نیل ہی تھا۔ غالبؔ

بہ سخن۔ اوج دہ ٔ مرتبہ معنی ولفظ	بہ کرم داغ نہ ناصیہ قلزم و نیل

دریائے نیل مصر کا بہت قدیم اور پراسرار دریا ہے۔ اس سے بہت سی تاریخی کہانیاں، دلچسپ داستانیں، عجیب و غریب روایتیں اور پیغمبروں کے قصے وابستہ ہیں۔ یوسف

وزلیخا کا عشق، فرعونوں کا جاو جلال ملکہ قلو پطرہ کی رنگین داستانیں۔ اہرام [1] اور ابوالہول [2] کے ہزاروں سال کے اسرار، ید بیضا اور اژدر موسیٰ کے معجزے من وسلویٰ [3] کی حلاوتیں، سامری کی جادوگری اور بنی اسرائیل کی نادانیاں غرض کہ اپنے سینہ میں مدفون ہزاروں واقعات لئے یہ دریا آج بھی اسی روانی سے بہہ رہا ہے۔ غالب ؔ

کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید	ہے جو آبی پیرہن ہر موج رودِ نیل کی

وادی نیل کی دونوں جانب ایک تنگ اور لمبا حاشیہ ہے جسے دو پہاڑی سلسلوں نے صحرا سے الگ کردیا ہے اسی کا نام مصر علیا ہے نیل کی شاخوں میں جو آبادیاں بسی ہوئی ہیں ان کو نشیبی مصر کہتے ہیں۔ مصر کی تمام زرخیزی، سبزہ زار اور باغات صرف دریائے نیل کے مرہون کرم ہیں۔

زُلیخا و یوسف

(زلیخا کا صحیح تلفظ بضم اول و فتح لام بروزن سویدا ہے۔ یہ فتح اول و بہ کسر دوم غلط ہے)

زُلیخا عزیز مصر کی حسین و جمیل بیوی کا نام تھا جو حضرت یوسفؑ سے عشق کرنے کی وجہ سے تمام عالم میں رسوا ہوئی۔

حضرت یوسفؑ بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر اور حضرت ابراہیم کے پوتے

---

۱ (حاشیہ:۔زمانہ قدیم کے مصری بادشاہوں (فرعون) کی حنوط شدہ لاشیں رکھنے کے مقبرہ کو اہرام کہا جاتا ہے یہ اہرام مصر میں بے شمار تھے لیکن طوفان نوح کے بعد اٹھارہ بچے تھے۔ مشہور ہے کہ یہ اہرام بارہ ہزار برس قبل تعمیر ہوئے تھے۔ ان اہراموں کا ذکر جالینوس نے بھی کیا ہے اور بڑے اہرام کا سنگ بنیاد حضرت ادریسؑ نے رکھا تھا۔

۔۲ ابوالہول مصر کا قدیم سنگی مجسمہ ہے جس کو قدیم مصر کے باشندے ہارماچیس (خدا) کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ یہ مجسمہ اندازاً چار پانچ ہزار سال قدیم ہے۔

۔۳ من وسلویٰ وہ غذا ہے جو حضرت موسیٰ کی دعا پر ان کی قوم کے لئے آسمان سے نازل ہوتی تھی۔ یہ ترنجبین کی مانند میٹھی چیز اور پرندے (بٹیریں) تھے۔ بنی اسرائیل نے جب لہسن، پیاز، مسور کا مطالبہ کرتے ہوئے اس کو کھانے سے منع کردیا تو اس کا نزول بند ہو گیا تھا۔)

تھے۔ قرآن مجید نے ان کے قصہ کو انداز بیان کے لحاظ سے 'احسن القصص' قرار دیا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر فوطیفار نے مصر کے بازار سے نیلامی میں خریدا تھا۔ اس نے اپنے گھر کا سارا انتظام ان کے سپرد کر کے مختار کل بنادیا تھا۔ حضرت یوسفؑ مردانہ حسن وجمال کا پیکر مجسم تھے ان کو دیکھ کر عزیز مصر کی نوجوان اور حسین بیوی زلیخا اپنا دل قابو میں نہ رکھ سکی اور دیوانہ وار ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ غالبؔ ؎

تھا خواب میں کیا جلوہ پرستار زلیخا	ہے بالش دل سوختگاں میں پرِ طاؤس

حضرت یوسفؑ نے زلیخا کی طرف کبھی التفات نہ کیا اور نہ کبھی اس کی ہمت افزائی کی دوسری طرف زلیخا اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لئے دن رات خواب دیکھا کرتی اور طرح طرح سے حضرت یوسفؑ کو گناہ کے لئے ورغلاتی۔ غالبؔ ؎

کرے کیا ساز بینش۔ وہ شہید درد آگاہی	جسے موئے دماغ بیخودی خواب زلیخا ہو
بھی آتی ہے بو، بالش سے اس کی زلف مشکیں کی	ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

حضرت یوسفؑ کے عشق میں زلیخا کی بڑی فضیحت و رسوائی ہوئی۔ شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتیں غلام سے عشق کرنے میں اس کو طعنے دیتی تھیں اور اپنی ہم چشموں میں زلیخا کا مذاق اڑاتی تھیں۔ زلیخا کے کانوں تک جب یہ باتیں پہنچیں تو اس نے ایک دن زنان مصر کی دعوت کا اہتمام کیا جب تمام عورتیں دستر خوان پر جمع ہو گئیں تو زلیخا نے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ترنج اور چھری دے کر سب کے روبرو یوسف کو بلایا۔ حضرت یوسفؑ کا حسن و جمال تو بے پناہ تھا ان کا چہرۂ زیبا شمس و قمر کی مانند تاباں اور درخشاں تھا زنان مصر حسن یوسف دیکھ کر اس درجہ مبہوت ہو گئیں کہ انھوں نے ترنج کاٹنے کی جگہ اپنی اپنی انگلیاں زخمی کرلیں۔ سب عورتوں نے یک زبان ہو کر جمال یوسف کی تعریف و توصیف کی جس کو سن کر زلیخا بہت خوش ہوئی۔ غالبؔ ؎

سب رقیبوں سے ہے ناخوش، پر زنانِ مصر سے	ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

حضرت یوسفؑ کا وطن کنعان تھا اس لئے ان کو ماہ کنعان اور ان کے پدر بزرگوار حضرت یعقوبؑ کو پیر کنعان کہا جاتا ہے غالبؔ ؎

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی	اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

ایک دن موقع پا کر زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو بلا کر کمرے میں بند کر لیا۔ حضرت

یوسفؑ کے لئے وہ مرحلہ بڑا سخت تھا۔ شاہی خاندان کی حسین وجمیل نازنین عشوہ طرازیوں کی بارش کررہی تھی دوسری طرف یوسف بھی جوان تھے لیکن وہ ایک لمحہ کے لئے بھی جذبات سے متزلزل نہ ہوتے اور انھوں نے ناپاک عشق سے صاف انکار کردیا۔ حضرت یوسفؑ کو جیسے ہی موقع ملا وہ دروازے کی طرف بھاگے زلیخا نے بھی ان کا پیچھا کیا اور دوڑتے میں ان کا پیراہن پیچھے سے چاک کردیا۔ کسی نہ کسی طرح یوسف دروازہ کھول کر باہر نکلے تو انھوں نے سامنے ہی عزیز مصر کو کھڑا پایا اس کے ساتھ ہی زلیخا کا چچیرا بھائی بھی موجود تھا۔ دونوں نے حیرت واستعجاب کے ساتھ اس منظر کو دیکھا۔ زلیخا عورت تھی اس نے اپنی فطری عیاری سے کام لے کر سارا الزام حضرت یوسف پر رکھ دیا کہ اس شخص کا ارادہ بد تھا۔ زلیخا کا چچازاد بھائی بہت ہوشیار اور عقلمند تھا اس نے فیصلہ کیا کہ اگر یوسف کا دامن آگے سے چاک ہے تو زلیخا بے خطا ہے اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو یوسف بے گناہ ہے۔ جب پیراہن یوسف دیکھا تو وہ پیچھے سے چاک تھا عزیز مصر کو حضرت یوسفؑ کی بے گناہی پر یقین تو آگیا مگر اس نے اپنی فضیحت اور رسوائی کے خوف سے حضرت یوسف کو زنداں میں ڈال دیا۔ اس طرح ایک معصوم کو مجرم بنادیا۔

اس واقعہ کے لئے زندانِ یوسف، حسنِ یوسف، خوابِ زلیخا۔ زنانِ مصر، مصر کا بازار، زلیخا کی جوانی اور ماہ کنعان کی تلمیحات مستعمل ہیں۔ غالبؔ ؎

ہنوز اک پرتو نقشِ خیالِ یار ہے باقی	دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

زم زَم، طَوفِ حَرَم اور جامۂ اَحرامَ

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

زم زم پہ ہی چھوڑو، مجھے کیا طوف حرم سے	آلودہ بہ مئے جامۂ احرام بہت ہے

اس شعر میں غالبؔ نے تین تلمیحات استعمال کی ہیں جو مجد دانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تلمیحات میں زمزمؔ۔ طوفؔ حرم اور جامۂ احرام کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہے۔

زم زم بیت اللہ شریف کے ایک متبرک کنویں کا نام ہے جس کے پانی کو بھی زمزم ہی کہتے ہیں یہ کنواں حرم کعبہ کے جنوب مشرق میں حجرالاسود والی دیوار کے مقابل

ہے۔ یہ کنواں ایک سو چالیس ۱۴۰ فٹ عمیق ہے اور ایک خوبصورت گنبد سے ڈھکا ہوا ہے۔ مسلمان اس کے پانی کو طیّب وطاہر سمجھتے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق اس کنویں کا پانی تمام امراض کے لئے شفا کا حکم رکھتا ہے اور غذا کا کام بھی دیتا ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر تسہیل جانکنی کے لئے آب زمزم کے قطرے مرتے وقت منہ میں ٹپکائے جاتے ہیں۔

حرم کے لغوی معنی ممنوع شئے کے ہیں لیکن اصطلاحاً بیت اللہ شریف کے ارد گرد کے احاطے کو کہتے ہیں جس سے طواف کی حد مقرر کی گئی ہے۔ اس کو حرم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مقام مقدس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے کاموں کے لئے ممنوع بھی ہے جیسے وہاں خون بہانا جائز نہیں ہے اسی طرح احرام کا مادہ بھی حرم جس کے معنی لسان العرب کے مطابق ممنوع قرار دینے کے ہیں۔ اس کی ضد حلال ہے یعنی جس کی اجازت ہو۔ مذہبی اصطلاح میں احرام ایک متبرک اور طاہر کیفیت کا نام ہے جس میں کوئی شخص محرم کہلائے۔ یہ کیفیت ایک تو نماز کے لئے ضروری ہے اور دوسرے حج اور عمرہ کے لئے۔ اس لفظ کی اصطلاح ایک مخصوص لباس (جامہ ٔاحرام) کے لئے بھی مستعمل ہے۔ یہ لباس حج اور عمرہ کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور مناسک حج میں شامل ہے اس میں ایک ازار (تہبد) جو ناف سے گھٹنوں تک ہوتا ہے اور دوسری ردا یعنی چادر جس سے ناف سے اوپر کا جسم ڈھانپا جاتا ہے یہ دونوں کپڑے سفید اور سادہ ہونا ضروری ہیں۔ عورتوں کے لئے کوئی خاص لباس مقرر نہیں ہے۔

اس طرح طوف حرم سے مراد کعبہ ابراہیمی کا طواف ہے جو جامہ ٔاحرام پہن کر ہر سال ۱۰؍ ذالحجہ کو دوران حج کیا جاتا ہے اور یہ یادگار ابراہیمی ہے۔ ان تلمیحات کے متعلق جو تفاصیل اور احکامات قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ موجود ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اپنی پہلی بیوی سائرہؓ کے اصرار پر دوسری بیوی ہاجرہ ؓاور ان کے شیر خوار بچے اسمٰعیل کو وادی غیر ذی زرع میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ جب ساتھ میں پانی ختم ہو گیا تو شیر خوار بچہ شدت تشنگی سے تڑپنے لگا۔ جناب ہاجرہؓ پانی کی تلاش میں اس وادئ بے آب وگیاہ میں ادھر ادھر دوڑنے لگیں اور انھوں نے دو پہاڑیوں صفا اور مروہ کے سات پھیرے کئے یہی وہ یادگار ''سعی بین صفا والمروہ'' جس کو مسلمان دوران حج کرتے ہیں

ساتویں پھیرے میں جب وہ مروہ پہاڑی پر تھیں تو انھوں نے جبرئیل کی آواز سنی۔ بی بی ہاجرہؓ کی درخواست پر جبرئیل کے سامنے آگئے اور انھوں نے اپنی ایڑی یا پر مار کر زمین کے اس حصہ کو چاک کر دیا اسی وقت اس شگاف سے صاف وشفاف پانی جاری ہو گیا۔ جناب ہاجرہؓ نے جب زمین سے پانی ابلتے دیکھا تو وہ بے حد خوش ہوئیں اور انھوں نے پانی کے چاروں طرف ریت کی باڑھ بنا کر کہا "زم زم" یعنی۔ رُک جا رک جا۔ اسی وقت سے اس چشمہ آب کا نام زمزم ہو گیا جس نے بعد کو کنوئیں کی شکل اختیار کر لی۔ مدتوں تک یہ کنواں مٹی سے اٹا رہا۔ حضرت عبدالمطلب نے اس کو تلاش کر کے نئے سرے سے درست کیا اور ۲۹ھ سے اس کنویں میں پانی کی بہتات ہو گئی ہے۔ ایک بار آنحضرت صلعم نے ارشادہ فرمایا تھا "خدا اُم اسمٰعیل پر رحم کرے اگر وہ زم زم کو باڑھ بنا کر نہ روکتیں تو آج وہ چشمہ عظیم ہوتا۔ غالبؔ ؎

رات پی زم زم پہ مئے اور صبح دم	دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

زُنّار

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

یہ ہوا ہے چمنِ جلوہ، ہے طاؤس برمست	باندھے ہے پیر فلک موجِ شفق سے زُنّار

زُنّار بہ وزنِ گفار کا اصل ماخذ آرامی لفظ "زُنّارا" ہے۔ سُریانی میں بھی اس پٹی یا پٹکے کو کہتے ہیں جس کو راہب اور دُرویش لوگ اپنی کمر سے باندھتے ہیں۔ قدیم عربی میں بھی زُنّار کے معنی پٹی کے ہیں جسے جادوگر، مجوسی اور ذِمّی لوگ اپنی عبا پر باندھ لیتے تھے۔ مرزا صائب فرماتے ہیں اروا از کمر زنار در بتخانہ محابا ید کشود۔ عربی جدید میں بالوں کی اس لٹ کو بھی زُنّار کہا جاتا ہے جو یہودی اپنی پیشانی پر جمائے رکھتے ہیں۔ اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بھی اختلاف ہے مگر تذکیر میں فصاحت ہے۔ اس کی مع "زُنّار" ہے۔

فارسی میں زُنّار مضبوط دھاگے کے بٹے ہوئے تو تاروں کو کہا جاتا ہے جس کو برہمن استعمال کرتے ہیں۔ ابو تراب فتوت فرماتے ہیں ؎

من برہمن مشرب بتخانہ یکر نگیم	از رگ سنگ صنم سازید زُنّار مرا

برہمنوں میں زُنار کو بائیں کاندھے پر رکھ کر داہنی بغل کے نیچے سے نکالا جاتا ہے اور زُنار پوشی ان کے لئے لازم ہے۔ جب دوسری ذات کے لوگ زُنار استعمال کرتے ہیں تو اس کے تاروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ غالبؔ ؎

بس کہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر	گرد صحرائے حرم تا کوچہ زُنار ہے

"زُہرہ نوا"

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

نغمہ ٔ مطربان زہرہ نوا	جلوۂ لولیان ماہ جبین

اس شعر میں زہرہ نوا کے معنی خوش خواں اور خوش الحان کے ہیں۔ زُہرہ تیسرے آسمان کا ایک مشہور سیارہ ہے جس کو فارسی میں ناہید، ہندی میں شکر، سمیری زبان میں زب، مصری میں ہونو، اور انگریزی میں "وینس" کہتے ہیں۔ اس کا مادہ زہر ہے جس کے معنی چمکنے اور منوّر کرنے کے ہیں یہ سیارہ چونکہ زیادہ روشن اور منور ہے اس لئے زہرہ کے نام سے مشہور ہوا۔ تورات میں اس سیارہ کو "ہلال بین السحر" یعنی صبح کا ستارہ کہا گیا ہے۔ قدیم مصر اور یونان کے لوگ اس سیارہ کو محبت کی دیوی سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔

مشہور ہے کہ زہرہ پہلے ایک حسین و جمیل مطربہ اور طوائف تھی اسی لئے اس کو لوئی فلک (قحبہ فلک) رقاصہ فلک اور مطربہ فلک بھی کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے "رقص ناہید" کی تلمیح مستعمل ہے۔ غالبؔ ؎

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی	ہوا بزم طرب میں رقصِ ناہید

ایک بار دو فرشتوں ہاروت و ماروت انسانی گناہوں اور معصیتوں پر استہزا کرتے ہوئے انسانوں پر فرشتوں کی برتری ظاہر کی تھی۔ اللہ تعالی نے ان کی یاوہ گوئی کو ناپسند کرتے ہوئے دونوں کو بغرض امتحان دنیا پر بھیجا تاکہ وہ انسانوں سے بہتر کردار دکھا سکیں۔ قرآن مجید میں ان دونوں کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے۔ "وَمَآ اُنزِلَ عَلَى المَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ" (البقر۔۹۶) یعنی اس سحر کا بھی جو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا

تھا شہر بابل میں۔ ان کا نام ہاروت ماروت تھا۔

قرآن مجید میں تو ہاروت ماروت کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن مفسرین نے ان فرشتوں کے متعلق متعدد روایتیں بیان کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بابل[1] پہنچ کر یہ دونوں فرشتے ہاروت و ماروت عرصہ دراز تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے اور دنیا کی طرف راغب نہ ہوئے۔ بابلؔ میں زہرؔہ اور مشتری نام کی دو طوائفیں رہتی تھیں جو اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے علاوہ سحر و ساحری میں بھی مشاق تھیں۔ ہاروت و ماروت ان طوائفوں کے عشق میں اس درجہ مبتلا ہوگئے کہ انھوں نے شراب پی زنا کیا۔ بتوں کو سجدہ کیا۔ قتل کیے اور ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہوگئے۔ ان فرشتوں نے دونوں طوائفوں سے سفلی عمل اور جادو بھی سیکھا اور اس کے بدلے میں اسم اعظم اور آسمانی علم ان کو سکھادیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اسم اعظم بھول گئے۔ دونوں طوائفیں اسم اعظم کی برکت سے آسمان پر پہنچ کر سیارہ بن گئیں۔ ہاروت و ماروت پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور وہ بابل کے ایک کنویں میں قید کردے گئے۔ مشہور ہے کہ قیامت تک وہ اس کنویں میں اُلٹے لٹکے رہیں گے۔ ان کی زبانیں شدت تشنگی سے باہر نکلی رہتی ہیں اور وہ جب بھی پانی کی طرف منہ بڑھاتے ہیں پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ بابل کا یہ کنواں اب بھی سحر و ساحری کے لئے مشہور ہے لوگ اس کنویں پر پہنچ کر اپنا جادو جگاتے ہیں اس سلسلہ میں چاہِ بابل، سحر بابل اور چاہ ماروت کی تلمیحات بھی مستعمل ہیں۔ سعدی شیرازی فرماتے ہیں ؎

بدیں کمال ندارند حسن در کشمیر
چنیں بلیغ ندارند سحر در بابل

---

[1] (بہ کسر سوم) نہر فرات پر مشرق کی جانب ایک قدیم شہر تھا۔ اس کی جگہ اب موجودہ شہر عراق بسا ہوا ہے۔ قدیم بابل کی اہمیت قصوں اور کہانیوں کی وجہ سے بہت ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ جنت سے بابلؔ میں ہی اتارے گئے تھے جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ لنکا کے پہاڑی سلسلہ کی سب سے بلند چوٹی پر اتارے گئے تھے جو ''کوہ آدم'' کے نام سے مشہور ہے۔

ساقی کوثر، موج کوثر، شراب طہور

کوثر کے لغوی معنی کثرت اور افراط کے ہیں۔ یہ مبالغہ کا صیغہ کثرت سے ہے لیکن قرآن مجید میں جس موقع پر استعمال کیا ہے اس میں محض کثرت ہی نہیں بلکہ نعمتوں کی کثرت، بھلائی اور خیر کا مفہوم نکلتا ہے۔ مفسرین نے اس کے اصطلاحی معنی بھی لکھے ہیں۔ جیسے طبری کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم جب بہشت کی سیر کو تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں ایک حوض دیکھا جس کو "حوض کوثر" کہتے ہیں۔ مفسرین نے "الکثیر" کے معنی میں کوثر کو جنت کے دریاؤں میں سے ایک دریا قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر سورۂ کوثر میں کیا ہے۔ اس نہر کے پانی کے متعلق طبری نے لکھا ہے "یہ برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے میٹھا اور دودھ سے زیادہ سفید ہے۔ قرآن مجید میں اس کے پانی کو "شراب طہور" بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا" یعنی ان کے رب نے شراب پلائی جو دل کو دھو گئی (دہر ۷۶) غالب ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو	کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

غالب ؎

غرور لطف ساقی نشہ بیباکی مستاں	تم داماں عصیاں ہے طراوت موج کوثر کی

نہر کوثر کو "نہر محمدؐ" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ آنحضرت صلعم کی نجی ملکیت ہے مشہور ہے آنحضرت صلعم اپنے دست مبارک سے جنتیوں کو آب کوثر تقسیم فرمائیں گے اس لئے آپ کو "ساقی کوثر" کہا جاتا ہے۔ شعیہ حضرات، صوفیائے کرام اور مرزا غالب کے نزدیک ساقی کوثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں غالب ؎

بہت سہی غم گیتی شراب کیا کم ہے	غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

غالب ؎

کب تلک پھیرے اسد لب ہائے تفتہ پر زباں	تاب عرض تشنگی اسے ساقی کوثر نہیں

سدِّ سکندر

سدّ (بالفتح صحیح ہے بالکسر غلط) کے معنی دیوار کے ہیں۔ سد سکندر سے مراد وہ دیوار ہے جو سکندر ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لئے سکندر نے کسی

نامعلوم مقام پر تعمیر کرائی تھی۔غالب ؎

حیرت انداز رہبر ہے عناں گیر اسدؔ
نقش پائے خضر، یاں۔ سدِ سکندر ہو گیا

سد سکندر کو لوہے اور تانبے کی آمیزش سے بنایا گیا تھا تاکہ کاکیشیا کے نیچے بسنے والے لوگ اور تبت و چین کے باشندے یاجوج ماجوج[1] کے فتنہ سے محفوظ ہو جائیں۔ مشہور روایت ہے کہ اس دیوار کو یاجوج وماجوج رات بھر چاٹتے رہتے ہیں جس سے وہ پتلی اور کمزور ہو جاتی ہے جب اس کے انہدام میں صرف دوسرے دن کی محنت باقی رہ جاتی ہے تو قدرت الٰہی سے شب بھر میں پھر صحیح وسالم ہو جاتی ہے اسی طرح یہ سلسلہ ہزاروں سال سے قائم ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ قیامت کے آنے میں جب صرف ''نفخ صور'' کامرحلہ باقی رہ جائے گا تو یہ دیوار خود بخود ہی ٹوٹ جائے گی اور یاجوج ماجوج پھیل کر ساری دنیا پر یلغار کریں گے۔مرزاصاحب فرماتے ہیں ؎

بہ مہر خامشی مسدود کردم رخنہ دل را
کہ ایں سد بر کہ می بند دسکندر می تواند شد

مشہور ہے کہ اس دیوار کی دوسری طرف کوئی نہیں دیکھ سکتا ہے۔جو شخص بھی یہ کوشش کرتا ہے وہ بے اختیار قہقہے لگانے لگتا ہے اور آخر کار ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔اسی لئے اس کو''دیوار قہقہہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

سد سکندر کے تعین اور اس کی جائے وقوع میں اختلاف ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ درحقیقت دیوار چین ہی سد سکندر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بخارا اور

---

[1] یاجوج ماجوج ایک خونخوار وحشی قوم ہے جو سکندر کو کوہ قاف کے کسی درے میں ملی تھی۔ اسرائیلی روایتوں کے مطابق ان کا قد بہت چھوٹا ہوتا ہے اور کان اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور ایک بچھانے کے کام آتا ہے یہ ایسی قوم ہے جو آدم کے صلب سے تو ہے مگر حوا کے بطن سے نہیں ہے یہ سب روائتیں باطل ہیں حقیقت میں یہ منگولیا کے وحشی قبائل ہیں جن کو یونانی زبان میں گاک میگاک کہا جاتا ہے۔ مولانا جمال الدین سلمان فرماتے ہیں ؎

برائے دفع یاجوج ماجوج فساد وفتنہ گیتی را
بہ شمشیر آہنیں سدمی کشید اسکندر

ترمذ والی دیوار و دربند ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ سد روسی علاقے والی دیوار ہے جس کو باب الابواب کہتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ یاجوج ماجوج کی چیرہ دستیوں کو روکنے کے لئے بھی متعدد دیواریں تعمیر ہوئی تھیں ان میں سے ایک دیوار چین ہے۔ ان دیواروں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآنی تصریحات کو بھی سامنے رکھا جائے۔ ان میں سے پہلی تو یہ ہے کہ سدِ سکندر دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے جس کی وجہ سے دونوں پہاڑوں کا درمیانی درہ بند ہو گیا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس کو لوہے سے بنایا گیا ہے جس میں تانبے کی بھی آمیزش ہے۔ دیوار چین کا مسئلہ تو اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ یہ تصدیق ہو چکا ہے کہ اس کو چین والوں نے ۲۴۰ ق م بنوایا تھا۔ اب رہی بخارا اور ترمذ والی دیوار تو اس میں کہیں بھی لوہا اور تانبہ استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ ساری دیوار اینٹ اور پتھر سے بنی ہوئی ہے اس کے علاوہ یہ دو پہاڑوں سے گزر کر میدانی علاقوں میں بھی بنی ہوئی ہے اس لئے یہ سد ذوالقرنین نہیں ہو سکتی ہے۔ روسی علاقے کی دیوار (باب الابواب) میں جا بجا لوہے کے پھاٹک ضرور لگے ہیں لیکن یہ بھی اینٹ اور پتھر سے تعمیر کی گئی ہے۔ اب ایک دیوار ''درۂ داریال'' رہ جاتی ہے جس کو ترکی میں ''دامر کپو'' کہتے ہیں یہ دیوار لوہے اور تانبے کی ہے۔ اکثر مفسرین نے اس کو ہی سد سکندر قرار دیا ہے ان میں علامہ وہبؒ۔ ابو حیانؒ۔ علامہ انور شاہؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی شامل ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی جدید تحقیق یہ ہے کہ درہ داریال درحقیقت خسرو کی تعمیر کردہ ہے کیونکہ ارمنی نوشتوں میں اس دیوار کا قدیم نام ''بھائی کورائی'' یعنی کور کا درہ تحریر ہے۔ کور سے مراد انہوں نے گوش (خسرو) کو لیا ہے۔ ان تمام باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ سدِ سکندر کہاں واقع ہے۔ غالب ۔

سدِ اسکندر ہے، بہر نگاہِ گل رخاں
گر کرے یوں امر، نہی بوتراب آئینے پر

سفیدی دیدۂ یعقوب

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

حضرت یعقوبؑ اور ان کے صاحبزادے حضرت یوسفؑ دونوں بنی اسرائیل کے برگزیدہ اور جلیل القدر نبی تھے۔ دونوں اس سلسلہ عظیم سے تعلق رکھتے تھے جو حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوا تھا اور مسلسل چار پشتوں تک چلتا رہا یعنی حضرت ابراہیم، حضرت اسحق، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ۔ اسی سلسلۂ نبوت کے لئے سب سے اہم جملہ ہے جو آنحضرت صلعم نے ان کے لئے فرمایا تھا کہ "الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم۔ حضرت ابراہیمؑ کو مجدّد انبیاء اور دین حنیف[1] کا موسس اول کہا جاتا ہے۔ ان کے مقدس ہاتھوں جس دین کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کی تکمیل بھی ان کی نسل سے تعلق رکھنے والے سرور کائنات خلاصۂ موجودات خاتم النبین حضرت محمد رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم نے الملتُ لکم دیںکم کا پیغام سنا کر کی۔ مرزا غالبؔ نے مذکورہ شعر میں اسی خاندانی عظمت اور بزرگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کا نور فراق یوسف میں رونے سے جاتا رہا تھا وہ درحقیقت زندان مصر کی دیواروں پر آگیا تھا۔ اس سفیدی میں صنعت ابہام ہے یعنی ایک تو وہ سفیدی جو آرائش کے لئے دیواروں پر کی جاتی ہے یعنی قلعی اور دوسری آنکھ کی پتلی کی سفیدی۔ سفیدی سے خانہ آرائی کا اشارہ اُسی موروثی تبلیغ اور دعوت حق کی طرف ہے جو حضرت یوسفؑ کو اپنے پدر بزرگوار سے ورثے میں ملی تھی زندان میں بھی ان کے حلقہ ارادت میں دوسرے زندانی اور اہلکاران شامل ہو گئے تھے۔ داروغہ زندان نے ان کے منصب اور اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر ان کو زندان کے اندرونی معاملات کا مہتمم بنادیا تھا۔ اسی طرح سالہا سال تک وہ ملت ابراہیمی کی تبلیغ زندان میں کرتے رہے اور لوگوں کے دلوں کو ایمان کو نور سے روشن و منور کرتے رہے۔ غالبؔ

قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

---

[1] حنیف حنف سے مشتق ہے جس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں۔ حضرت ابراہیم قوم سبا میں مبعوث ہوئے تھے یہ قوم ستارہ پرست تھی جب اس قوم نے اپنے عقائد سے مڑ کر حضرت ابراہیم کا دین اختیار کیا تو دین حنیف کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اہل عرب کا خیال ہے کہ خود حضرت ابراہیم کا نام بھی حنیف تھا۔

سکندر و خضر

سکندر ایک مشہور فاتح کا نام ہے جس نے دنیا کے متعدد ممالک فتح کیے اور فاتح اعظم کے لقب سے مشہور ہوا۔ کنایۃً خوش بخت اور عالی مرتبت شخص کو کہتے ہیں۔ سکندر کے وزیر کا نام خضر بتایا جاتا ہے اکثر یہ دونوں نام تلمیحاً ایک ساتھ آتے ہیں۔ غالب ؂

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

سکندر کے واقعات کو "سکندر نامہ" کے عنوان سے مختلف شعرا نے نظم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو فردوسی کا نام آتا ہے جنہوں نے مختصر طور پر سکندر کے واقعات لکھے ہیں اس کے بعد مولانا نظامی گنجوی۔ امیر خسرو اور مولانا جامی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ترکی زبان کے شعرا میں احمدی اور میر علی شیر نوائی کا کلام فردوسی سے ماخوذ ہے۔ ہندوستان میں گوکل پرشاد کی کتاب "کارنامہ سکندری" اور جمال الدین کا "قصہ سکندر" بھی مشہور ہے۔ ان کتابوں میں سکندر کو ایک پراسرار شخصیت ظاہر کیا گیا ہے۔ سکندر کے ساتھ خضر، ارسطو، آب حیات، ظلمات سد سکندری، دیوار قہقہہ، یاجوج ماجوج اور ذوالقرنین کے بے شمار قصے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سکندر نام کے دو جلیل القدر بادشاہ گزرے ہیں جو فاتح اعظم کہلاتے ہیں ان دونوں بادشاہوں کے اوصاف اور ان کے واقعات کو اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا دو سکندروں میں سے ایک سکندر یونانی تھا اس کو سکندر رومی یا مقدونی بھی کہتے ہیں۔ یہ یونان کے بادشاہ فیلپس کا بیٹا تھا اور حضرت عیسیٰؑ سے تین سو سال قبل پیدا ہوا تھا۔ سکندر یونانی روم اور سکندریہ کا بانی تھا۔ اس کے مشیر، وزیر اور استاد کا نام ارسطو، تھا۔ اس سکندر نے دارا ابن دارا کو قتل کر کے فارس کے ممالک پر قبضہ کیا تھا اس نے ہندوستان اور چین پر بھی حملے کیے تھے اور متعدد شہر بسائے تھے۔ ۳۲۳ ق م میں عراق آکر فوت ہوا۔

قرآن مجید نے ایک پراسرار شخصیت ذوالقرنین[1] کا ذکر کیا ہے۔

مفسرین نے اس کا نام بھی سکندر بتایا ہے اور یہ عام طور پر سکندر ذوالقرنین کے نام سے مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ سَدًّا ۝ (الکہف ۱۸۔۸۲) یعنی انھوں نے عرض کیا کہ اے ذوالقرنین قوم یاجوج ماجوج اس سرزمین پر بڑا فساد برپا کرتے ہیں۔ سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ جمع کریں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان کوئی سد (روک) تعمیر کر دیں"۔

سکندر ذوالقرنین ایک عادل بادشاہ اور سام بن نوح کی اولاد تھا۔ جبکہ سکندر رومی ایک جابر اور بت پرست بادشاہ تھا۔ ذوالقرنین کے وزیر کا نام خضر اور سکندر رومی کے وزیر کا نام ارسطو تھا۔ قرآن مجید نے سکندر ذوالقرنین کے جو اوصاف بتائے ہیں ان میں اس کی تین تاریخی مہموں کا ذکر ہے جو اس نے اپنی زندگی میں سر کی تھیں۔ پہلی مہم میں وہ مطلع شمس تک پہنچا تھا یعنی جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے اور آبادیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے دوسری مہم اس نے مغرب الشمس یعنی غروب آفتاب کے مقام کی سیر کی تھی تیسری مہم میں اس کا واسطہ ایک ظالم سرکش اور پراسرار قوم یاجوج ماجوج سے پڑا تھا جس کے فتنہ کو روکنے کے لئے اس نے لوہا اور تانبہ ملا کر ایک دیوار (سد سکندری) تعمیر کرائی تھی۔

مشہور ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے اپنے وزیر خضر کے ساتھ ظلمات کا سفر کیا تھا

---

[1] قرن کے معنی گیسو کے ہیں یا سینگ یا سو برس کی مدت کے۔ اس لئے ذوالقرنین سے مراد دو گیسو یا دو سینگ والا یا دو سو برس تک حکومت کرنے والا۔ سکندر کو ذوالقرنین کہنے کی مختلف روایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے سر پر دونوں جانب دو عدد یا دو سینگ اُبھرے ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا خیال ہے کہ وہ دراز زلفیں ہونے کی وجہ سے دو چوٹیاں گوندھا کرتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ اس کی دعوت توحید پر خفا ہو کر اس کی قوم نے ایسی ضرب لگائی تھی کہ اس کے سر پر دو نشان بن گئے تھے بعض لوگ اس کے نجیب الطرفین ہونے اور والدین کی نجابت کو قرن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بتاتے ہیں کہ اس کی عمر دو سو برس کی ہوئی اس لئے ذوالقرنین کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے زمین کی روشنی اور تاریکی کی سیاحت کی یا وہ علوم ظاہر و باطن کا حامل تھا اس لئے اس لقب سے مشہور ہے۔

یہ مقام اتنا تاریک تھا کہ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ گھور اندھیرا تھا جیسے اس مقام نے کبھی آفتاب کی شکل نہ دیکھی ہو۔ اس تاریکی میں سکندر تو راستہ بھٹک گیا لیکن خضر نے منزل مقصود تک پہنچ کر آب حیات[1] پی کر حیات جاوداں پائی۔ غالبؔ ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
یہ حسرت گاہ ناز کشتہ، جاں بخشی خوباں	خضر کو چشمہ آب بقا سے ترجبیں پایا

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سکندر ذوالقرنین بھی خضر کے ساتھ ہی چشمہ آب حیات تک پہنچا تھا مگر اس نے چشمہ کے کنارے ہزاروں چرند، پرند اور درندا یسے دیکھے جو آب حیات پی کر حیات دوامِ تو پا چکے تھے لیکن اس زندگی سے عاجز پڑے سسک رہے تھے۔ ان کے جسموں میں جان بیشک تھی لیکن وہ توانائی اور حرارت سے محروم تھے۔ اس عجز و بے چارگی کی زندگی سے سکندر کو بڑی عبرت حاصل ہوئی اور اس نے ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہوئے آب حیات کا چلو جو پینے کی غرض سے بھرا تھا چشمہ میں ہی پھینک دیا۔ سکندر کی اس محرومی اور خضر کی کامرانی کا ذکر اکثر شعرا نے کیا ہے۔ غالبؔ ؎

کیا کیا ؟ خضر نے سکندر	اب کسے رہنما کرے کوئی

اسد جز آب بخشیدن زوریا خضر کو کیا تھا
ڈبوتا چشمہ حیواں میں گر کشتی سمندر کی

مذکورہ بالا دونوں سکندروں (ذوالقرنین اور رومی) میں تقریباً دو ہزار سال کا فرق ہے۔ دونوں کے اوصاف اتنے مختلف ہیں کہ سکندر رومی کو ذولقرنین کہنا مغالطے کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ کچھ علماء اور مفسرین تو سکندر ذوالقرنین کی نبوّت کے بھی قائل ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزادؔ بھی شامل ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں بلکہ ایک عادل بادشاہ تھا۔ وہ فرشتہ نہیں بلکہ انسان تھا جس نے اللہ کو محبوب رکھا اور اللہ نے اس کو محبوب رکھا۔

---

[1] آب حیات ایسے پانی کو کہتے ہیں جس کے پینے سے موت کبھی نہیں آتی اور حیات جاوداں حاصل ہو جاتی ہے کنایۃً لطیف، شیریں، مفرح اور جاں بخش چیز کو بھی کہتے ہیں۔ آب حیات کو ہندو دیومالا میں امرت کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ سمندر منتھن سے نکلے ہوئے چودہ رتنوں میں امرت بھی شامل تھا جس کو پی کر دیوتاؤں نے حیات دوام پائی تھی۔ آب حیات کو آب حیواں، آب بقا، آب زندگانی اور آب خضر بھی کہتے ہیں۔

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں	زہر کچھ اور سہی۔ آب بقا اور سہی
لب نگار آئینہ دیکھ آب حیات	ہے گرہی سکندر ہے محو حیرانی

شیشۂ حلبی

مرزا غالبؔ فرماتے ہیں۔

چمن میں کس کی، یہ برہم ہوئی ہے، بزم تماشا
کہ برگ برگ سمن، شیشہ ریزہ ٔ حلبی

حلب ملک شام کا مشہور شہر ہے۔ اکثر شعرا نے آئینۂ حلبی کو تلمیح استعمال کیا ہے کیونکہ اس شہر کے بنے ہوئے آئینے تمام دنیا میں پسند کیے جاتے ہیں۔

حلب کو انگریزی میں Aleppo کہتے ہیں۔ یہ بہت قدیم شہر ہے یہ بھی مشہور ہے کہ یہ شہر حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار قبل حلب۔ حلو اور حلوان کے ناموں سے مشہور تھا۔ قدیم بابل کے تذکروں میں اشوریوں کے صلح نامہ میں بھی ۷۵۰ ق م میں اس شہر کا ذکر موجود ہے۔ مصری تحریروں میں اس شہر کا نام حرب تھا۔ تورات کے مطابق بھی ارم کی خط و کتابت اس شہر سے ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اس شہر کو ۱۶ھ میں خالد بن ولید اور ابو عبیدہ بن جراح کے مشترکہ حملے سے حاصل کیا تھا اس کے بعد سے حلب کو فوجی، مذہبی اور صنعتی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ایوبی سلطنت کی تمام دولت حلب میں ہی محفوظ تھی اسی طرح مملوک سلطانوں کے زمانے میں اس شہر نے کافی ترقی کی اور طرح طرح کی صنعتیں یہاں قائم ہوئیں۔

صاحبقرانی

مرزا غالبؔ کا شعر ہے۔

تم کرو صاحبقرانی جب تلک	ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

"صاحبقرانی" کنایۃً طویل حکومت کو کہتے ہیں۔ قراں کے معنی قربت۔ برابری اور اتصال کے ہیں۔ علم نجوم کی اصطلاح میں دو سیاروں کا ایک برج میں جمع ہونا 'قران' کہلاتا ہے۔ جب دو سیارے زہرہ و مشتری یا قمر و زہرہ یا قمر و مشتری ایک ہی برج میں جمع ہوں تو یہ "قران السعدین" کہلاتا ہے اس میں بھی زحل و مشتری کا قران السعدین جو مدت دراز کے بعد ہوتا ہے بہت مبارک اور اچھا سمجھا جاتا ہے۔ زحل اور مشتری کے قران السعدین میں جب کوئی پیدا ہوتا ہے یا اس کا نطفہ ٹھہرتا ہے تو وہ بہت خوش نصیب عالی مرتبت اور بخت آور ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر پیدا ہونے والے بادشاہوں کی حکومت بھی عرصۂ دراز تک رہتی ہے اور ان کو صاحبقران کہا جاتا ہے۔ امیر تیمور کو صاحبقران اول اور شاہجہاں کو صاحبقران ثانی اسی لئے کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی صاحبقران تھے۔

صورِ اسرافیل

اسرافیل چار مقرب فرشتوں میں سے ایک ہے۔ صاحب تاج العروس نے اسرافیل کو عبرانی لفظ سرافیم کی شکل قرار دیا ہے جو سرافیل بن کر اسرافیل ہو گیا ہے۔ صور کے لغوی معنی تُرئی، قرنا اور نرسنگھا کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں بابلی، آرامی، کنعانی اور عبرانی قوموں میں شاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے لئے نرسنگھا پھونکنے کا عام رواج تھا۔ اس عمل کو غیر معمولی خطرے کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔

قرآن مجید میں صور (نرسنگھا) کی خصوصیت کا ذکر متعدد سورتوں میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ایک فرشتہ مقرب (اسرافیل) دوبار صور پھونکے گا۔ پہلی آواز سے ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے گی اور پھر دوسری آواز سے سارے مردے دوبارہ جی اٹھیں گے۔ غرض کہ اس دن شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرۂ حساب کا اعلان صور پھونک کر ہوگا۔ غالب ؔ

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا
گویا ابھی سنی نہیں، آواز صور کی

اسرافیل ان چار فرشتوں میں سے ایک ہے جن کے سپرد علاحدہ علاحدہ کام ہیں اس کے متعلق طرح طرح کی غیر قرآنی روایات بھی مشہور ہیں۔ مثلاً صاحب عجائب المخلوقات نے لکھا ہے کہ اسرافیل کا قد و قامت حیرت انگیز ہے کیونکہ اس کے پاؤں تحت الثریٰ میں اور سر آسمان سے بھی اونچا ہے۔ اس کے چار بازو ہیں جن میں سے ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں ہے وہ اپنے ایک بازو سے اپنا جسم ڈھانپتا ہے اور چوتھا بازو قہر و غضب سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے پورے جسم پر بال اور زبانیں ہیں۔ یہ فرشتہ لوح محفوظ سے احکامات پڑھ کر دوسرے فرشتوں کو آگاہ کرتا ہے۔ دن بھر میں تین بار اور رات میں تین بار یہ دوزخ کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے سکندر ذوالقرنین کو ظلمات کے سفر میں یہ فرشتہ نرسنگھا لیے ایک پہاڑی پر کھڑا ملا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ قیامت کے دن دوبارہ جی اٹھنے والوں میں یہ فرشتہ پہلا ہوگا پھر وہ بیت المقدس میں ایک مخصوص مقام سے اپنا نرسنگھا پھونکے گا جس کی آواز سے تمام مردے دوبارہ جی اٹھیں گے اسی قسم کی ہزاروں اسرائیلی روایتیں اور کہانیاں موجود ہیں جن سے محتاط مفسرین ہمیشہ احتراز کرتے رہتے ہیں۔ غالب ؔ

پھونکتا ہے نالہ۔ ہر شب صور اسرافیل کی	ہم کو جلدی ہے مگر تو نے قیامت ڈھیل کی

(نوٹ) مرزا غالب نے اس شعر میں صور کو مونث لکھا ہے حالانکہ وہ مذکر ہے۔

طُغرل و سنجر

مرزا غالبؔ کا شعر ہے۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریب طغرلؔ و سنجر کھلا

طغرلؔ و سنجرؔ دو سلجوقی بادشاہوں کے لقب ہیں۔ طغرل لقب کی ابتدا طغرلؔ بیگ کے نام سے ہوئی تھی جو پہلا سلجوقی سلطان تھا۔ اس کا اصل نام رکن الدین ابو طالب محمد بن میکائیل تھا طغرل بیگ کا عہد حکومت ۴۲۹ھ سے ۴۵۵ھ تک رہا اس کے بعد طغرل بن محمد طغرل اول کے لقب سے مشہور ہوا۔ طغرل دوم بن ارسلان عراق کا آخری سلجوقی سلطان تھا جس کا زمانہ ۴۹۰ھ تک رہا۔ مشہور ہوا۔

سنجر بھی سلجوقی سلطان تھا اس کا اصل نام احمؔد تھا یہ سلطان ملک شاہ ابو الحارث کا بیٹا تھا۔

طلائے دست افشار اور ترنج زر

طلائے دست افشار ایسے کندن سونے کو کہتے ہیں جو موم کی مانند نرم ہو اور ہاتھ سے دبانے پر حسب منشا شکل اختیار کر لے۔ اس سونے کو طلائے دست افشار، زر دشت افشار، سیم دشت افشار اور زر مشت افشار بھی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایران کے مشہور بادشاہ خسرو پرویزؔ[1] کے خزانے میں یہ سونا موجود تھا۔ چنانچہ صائب فرماتے ہیں۔

---

[1] خسرو اول نوشیرواں کے پوتے اور ہرمز چہارم کے بیٹے کا نام خسرو پرویز تھا جو ۵۹۰ھ میں اپنے باپ کو قتل کر کے تخت نشین ہوا اور خسرو دوم کہلایا پھر بعد کو بہرویز (فارسی پرویز) بمعنی مظفر کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے اپنے اڑتیس سالہ دور حکومت میں متعدد ممالک فتح کیے اور بے شمار دولت جمع کی۔ ۶۲۸ھ میں اپنے بیٹے شیرویؔہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ عربی اور فارسی شعرا نے اس بادشاہ اور اس کے عجائبات کو اکثر تلمیحاً استعمال کیا ہے (تفصیل تلمیح "عشق و مزدوری عشرتگہ خسرو" میں دیکھیں)

اگر چہ خسرو دارد طلائے دست افشار	تصرف دل شیریں بہ دست کوہکن است

مرزاداراب بیگ جویاکا شعر ہے ۔

بہ مستی گر رسد دستم بہ لبہائے نمک سودش	شودیا قوتِ دست افشار لعل خندہ آلودش

اس افسانوی کندن کے متعلق مرزا غالب نے لکھا ہے۔

آم کو دیکھتا اگر یک باز	پھینک دیتا طلائے دست افشار

مشہور ہے کہ خسرو پرویز اس سونے کو ہاتھ سے دبا کر طرح طرح کی چیزیں بنالیا کرتا تھا۔ اکثر وہ اس کا ترنج بنا کر اپنے دستر خوان پر بطور زینت بھی رکھا کرتا تھا۔ سونے کے اسی ترنج کو "تلمیحاً ترنج زر" کہا جاتا ہے۔ مرزا غالب نے آموں کی تعریف میں لکھا ہے ۔

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل	ہم کہاں ، ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنج زر ایک خسرو پاس	رنگ کا زرد ، پر کہاں بوباس

طلائے دست افشار اور ترنج زر کی تلمیحات کو اکثر فارسی شعرا نے استعمال کیا ہے۔ عرفی فرماتے ہیں ۔

زمانہ گفت تو پرویز من ترنج زرم	بہ کام خود بہ طرازم چنانکہ می دانی

نورالدین ظہوری ۔

ترنج سیم دست افشار خسرو	انار سینہ ٔ شیریں وشاں کو

طوبیٰ وسدرہ

مرزا غالب ۔

رہروِ راہِ خلد کا توشہ	طوبیٰ وسدرہ کا جگر گوشہ

طوبیٰ وسدرہ دو درختوں کے نام ہیں جن میں سے اول الذکر جنت کا اور آخر الذکر عرش کا درخت ہے۔

طوبیٰ کے معنی خوشبودار کے ہیں۔ مشہور ہے کہ جنت کے اس درخت طوبیٰ کی شاخیں ہر ایک اہل جنت کے مکان پر اس طرح چھائی ہوں گی کہ ان کی خوشبو سے تمام مکانات معطر ہوں گے۔ ان شاخوں سے طرح طرح کے میوے، پھل اور خوشبوئیں حاصل

ہوں گی۔ جنتیوں کا جب بھی کسی میوے یا پھل کھانے کا دل چاہے گا اس درخت کی شاخیں خود بہ خود جھک کر اس کے سامنے آ جائیں گی اور مطلوبہ شئے ان کو مل جائے گی۔

سدرہ یا سدرۃ المنتہیٰ انتہا کی بیری کا درخت ہے جو جبرئیل فرشتہ کے رہنے کا مقام ہے اس درخت کی جڑ پانچویں یا چھٹے آسمان پر ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی آگے ہیں یہ درخت نزول اور عروج کا ہے یعنی جہاں سے چیزیں زمین پر اترتی ہیں اور اوپر چڑھتی ہیں۔ اس مقام سے آگے آنحضرت صلعم کے علاوہ کسی اور نبی یا فرشتہ کا گزر نہیں ہوا ہے۔ اسی درخت پر جبرئیل کو احکامات باری تعالیٰ ملتے ہیں اور جو کچھ اس کو عرض کرنا ہوتا ہے وہ یہاں سے ہی عرض کرتا ہے اس سے آگے بڑھنے کی اس کو بھی اجازت نہیں ہے۔

آنحضرت صلعم نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اس درخت کی مفصل کیفیت بھی ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کا آخری جملہ یہ ہے کہ ''خدا کی خاص تجلیؔ نے اس درخت کو حیرت انگیز طور پر روشن، چمکدار اور پر کیف بنا دیا تھا''۔

محدثین کے نزدیک اس درخت سے حقیقتاً ایمان و حکمت کو مشکل اور مصور طریقہ سے ظاہر کیا گیا ہے اس سے تمثیلاً بتایا گیا ہے کہ پھل ذائقہ میں نیت صالحہ، خوشبو میں قول صالح اور سایہ میں عمل صالح کا اظہار ہوتا ہے اور ان سب کا مجموعہ ''ایمان'' ہے اس طرح آنحضرت صلعم نے ایمان کو شجر سے تشبیہ دی ہے۔

ظہوریؔ۔ عرفیؔ۔ طالبؔ

مرزا غالبؔ فرماتے ہیں ؎

تھے ظہوری وعرفی وطالب	اپنے اپنے زمانے میں غالبؔ
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے	اسد اللہ خاں غالبؔ ہے

یہ تینوں مشہور ایرانی شعرا تھے جو ہندوستان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ان تینوں کا مختصر تعارف اس طرح ہے۔

(۱) ظہوری

نورالدین محمد ترشیزی کا تخلص ظہوری تھا وہ نواح سبزدار کے خطہ ترشیز میں پیدا ہوا تھا اور ہندوستان آ کر دکن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ فیضی کا ہمعصر تھا اس کی شاعری

ایران سے زیادہ ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ اس کی تصانیف میں گلزار ابراہیم (دیوان) خوان خلیل اور رقعات ظہوری مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ ساقی نامے بھی بہت مشہور ہوئے جو اس نے احمد نگر کے نظام شاہ دوم (۹۹۹۔ ۱۰۰۳ء) کے نام معنون کیے تھے۔ ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ والئی بیجاپور کی مدح میں بھی متعدد تصانیف چھوڑی ہیں۔ ملک الشعرا فیضی کو لکھے گئے ایک خط میں ظہوری کی غزل کا مطلع یہ تھا۔

ازدم تیغ تگہ تن تپیدن دہیم
سرمۂ حیرت کیشم دیدہ بدیدن دہیم

(۲) عرفی

شیراز کے مشہور شاعر جمال الدین کا تخلص عرفی تھا اس کے باپ کا نام زین الدین بن جمال الدین سعیدی تھا جو شیراز میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھا۔ بچپن میں عرفی کے چیچک نکلی تھی جس سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ عنفوان شباب میں ہندوستان آیا اور حکیم ابوالفتح گیلانی کی وساطت سے دربار اکبری میں مقام حاصل کیا۔ اس نے فغانی کی طرز پر غزل گوئی کی اور لطیفہ گوئی میں شہرت پائی۔ اس کا مذہب اثنا عشری تھا اس لیے ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائی اس سے عناد رکھتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے اکثر عرفی پر چوٹ کی تاکہ وہ اکبر کی نظروں سے گر جائے مگر اس کی حاضر جوابی سے کامیابی نہ ہو سکی۔ صاحب مرآۃ الخیال نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ عرفی کی ملازمت کے پہلے دن ابولفضل نے دریافت کیا کہ زاغ حرام ہے یا حلال۔ عرفی نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر فیضی نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں خوک حلال ہے یا حرام۔ عرفی پھر بھی خاموش رہا دونوں بھائیوں کے سوالات اور عرفی کے تغافل کو شہنشاہ اکبر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ابوالفضل کے تیسرے سوال سے قبل ہی اکبر نے جواب نہ دینے کی وجہ عرفی سے دریافت کی۔ عرفی نے انتہائی متانت سے جواب دیا اس کے جوابات سے دونوں بھائی خود ہی واقف ہیں کیونکہ دونوں ان چیزوں کو کھاتے ہیں اس جواب پر بادشاہ کو ہنسی آگئی اور اس نے عرفی کو انعام واکرام سے نوازا۔

عرفی نے حمد، نعت اور منقبت کے علاوہ حکیم ابوالفتح گیلانی، شہنشاہ اکبر، خانخانان اور شہزادہ سلیم کی مدح میں متعدد قصائد لکھے تھے۔ حکیم ابوالفتح تو اس کا محسن تھا اس لیے اس

کی مدح میں عرفی نے آٹھ قصائد لکھے تھے جن میں سے ایک مشہور قصیدہ کا شعر یہ ہے۔

بام گلبانگ پریشاں می زنم	آتشے درعندلیباں می زنم

بعض تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے عشق میں مبتلا ہو کر ہندوستان آیا تھا مگر یہ روایت محض بے سروپا اور غلط ہے اس زمانے میں ایران کے شعرا مغلوں کی قدر شناسی کا تذکرہ سن سن کر ہندوستان آرہے تھے ان میں عرفی بھی شامل تھا۔ عرفی کے سب سے مشہور قصیدہ کا مطلع یہ ہے ؎

جہاں بگشتم و دردا کہ ہیچ شہر و دیار
نیا فتم کہ فروشند بخت دربازار

اس قصیدے کا جواب اکثر ہندوستانی شعرا نے دیا ہے خصوصاً متاخرین میں شیخ محمد سعید قریشی نے طنزیہ طور پر جو جواب دیا ہے اس کا مطلع یہ ہے ؎

زمفلسی چونہ باشد بہ دست یک دینار
چہ سوداگر بہ فروشند بخت دربازار

طالب

مرزا ابو طالب کلیم کا قدیم وطن کاشان تھا۔ اور اس نے بعد کو ہمدان میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ عہد جہانگیری (۱۶۰۵۔ ۱۶۲۷ء) کے شروع میں ہی وہ ہندوستان آکر دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کے اشعار پر اکثر نور جہاں اعتراض کرتی تھی ایک دن اس نے یہ شعر لکھ کر نور جہاں کی خدمت میں بھجوایا جس سے ناراضگی دور ہو گئی ؎

زشرم آب شدم آب راشکستی نیست
بحیرتم کہ مرا روز گار چوں بشکست

جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے دربار میں اس کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ اس کی وفات ۱۶۵۲ء میں کشمیر میں ہوئی۔ اس نے لگ بھگ ۲۴ ہزار اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں جو دیوان کی صورت میں ۱۸۷۸ء میں لکھنو سے شائع ہوئے۔

عشق ومزدوریٔ عشرتگۂ خسرو

مرزا غالب کا شعر ہے ۔

عشق ومزدوری عشرتگہ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

اس تلمیح کا تعلق خسرو پرویز (۶۲۸۔۵۶۰ء) کی بیوی اور محبوبہ شیریں سے فرہاد سنگتراش کے عشق اور اس سلسلہ میں کوہ بے ستون کی کوہکنی سے ہے۔ شیرین وفراہاد کا عشق اور داستان محبت اُردو وفارسی کی رزمیہ کہانیوں اور عشقیہ قصوں کا ایک مقبول عام موضوع رہا ہے اس قصہ کی اصل شہرت مولانا نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسف المعروف بہ نظامی گنجوی (۱۱۴۰۔۱۲۳۰ء) کے مشہور خمسہ کی ایک مثنوی "خسرو شیریں" سے ہوئی ہے۔ اس مثنوی کا سن تصنیف ۵۷۱ھ ہے۔

کہتے ہیں کہ مشہور زمانہ سنگتراش فرہاد نے اپنی محبوبہ شیریں کے لئے کوہ [1] بے ستون تراش کر ایران کے مشہور بادشاہ خسرو پرویز [2] کے محل تک ایک نہر نکالی تھی جس کے ذریعہ بکری کا تازہ دودھ محل تک پہنچتا تھا۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے لکھا ہے کہ ملک ارمن کی ایک خاتون حکمراں شہمیرا یا مہین بانو تھی۔ اس کا دار الخلافہ بروع تھا۔ مہین بانو کی حسین وجمیل بھیجتی شیرین پر خسرو نادیدہ عاشق ہو گیا تھا اسی زمانہ میں ایران پر بہرام چوبیں نے قبضہ کر لیا تھا اور خسرو بھی بروع پہنچ گیا تھا۔ شیریں نے شرط وصال یہ رکھی تھی کہ وہ پہلے اپنے موروثی ملک کو واپس لے۔ خسرو نے قیصر روم سے مدد مانگی اور قیصر کی لڑکی مریم سے شادی بھی کی چنانچہ رومی لشکر جرار کی مدد سے خسرو نے بہرام چوبیں کو زبردست شکست دے کر اپنا ملک واپس لے لیا۔ شیرین نے مدائن پہنچکر بیرون شہر ایک محل بنوایا اور وہاں رہنے لگی کیونکہ مریم بنت قیصر یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ شیرین بھی افراسیاب کی نسل کی معزز شہزادی تھی وہ بھی خسرو سے بیزار ہو گئی مگر اس غم میں بیمار

---

[1] (حاشیہ:۔ بے ستون کرمان شاہ سے بیس میل کے فاصلہ پر بغداد سے ہمدان والی سڑک پر مشہور پہاڑ ہے۔

[2] عربی اور فارسی شعراء نے خسرو کے متعدد عجائبات کا ذکر کیا ہے، کچھ کی تفصیل دی جاتی ہے۔

جاری

رہنے لگی۔ حکیموں نے اس کے لئے بکری کا تازہ دودھ بتایا تھا مگر قصر شیریں ایسے مقام پر تھا کہ وہاں پہنچتے پہنچتے دودھ باسی ہو جاتا تھا۔ اسی دوران مریم کا بھی انتقال ہو گیا اور شریعت زردشتی کی رو سے خسرو اور شیرین کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی بکری کے تازہ دودھ کا مسئلہ اب بھی باقی تھا وہ اسی صورت میں حل ہو سکتا تھا کہ کوہ بے ستون کو تراش کر ایک نہر قصر شیریں تک نکالی جائے مگر یہ سب خواب وخیال کی بات تھی کیونکہ بے ستون کافی سخت

(۱) تخت طاقدیس:۔

خسرو کا عجیب وغریب تخت تھا جو فریدوں کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اس پر بروج اور کواکب کی صورتیں منقش تھیں۔ خسرو نے اس میں جدتیں بھی کی۔ یہ ہاتھی دانت اور ساگون کا نیا تخت ۱۸۰ ہاتھ لمبا ۱۳۰ ہاتھ چوڑا اور ۱۵ ہاتھ بلند تھا اس پر لاجورد اور سونے کا کام تھا۔ اس کے گنبد کے اندر سات آسمان، ستارے، برج اور ساتوں اقلیم کی شکلیں بنی تھیں۔ اس کے علاوہ بادشاہوں کی تصویریں، رزم بزم کے نظارے اور شکار کے منظر کندہ تھے۔ حکیم سوزنی ؎

بہ زیر تختہ خواہد بود جایم	اگر سلطان تخت طاقدیسم

(۲) باربدؔ گویا:۔

باربدؔ خسرو کے خاص مصاحب اور گویے کا نام تھا۔ باربدؔ کے لغوی معنی حاضر باش کے ہیں چونکہ وہ خسرو کے دربار کا حاضر باش تھا اس لیے اس لقب سے مشہور ہوا۔ برہان قاطع کے مطابق باربد ایرانی موسیقی کا موجد تھا اس نے خسرو کے لئے تیس لحن اور تین سو ساٹھ راگنیاں تصنیف کی تھیں۔ باربدؔ موسیقی کے علاوہ بربط نوازی میں بھی لاثانی تھا۔ سرود مسجع (سرود خسروی) اسی کی ایجاد ہے۔ موسیقی کی مشہور کتاب "گنج عروس" کا بھی مصنف تھا ۶۲۷ء میں بعمر ۲۷ برس اس موسیقار نے انتقال کیا۔ غالبؔ ؎

خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزم سخن	شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

(۳) قصر طیسطون:۔

خسرو کا مشہور محل ہے جو خسرو اول نے بنوایا تھا اس میں خسرو کے تمام خزانے رکھے جاتے تھے۔ یہ محل مدائن کے محلہ اسپان بر میں تھا اور ساسانی عمارتوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔

جاری

پتھر کا بلند پہاڑ تھا۔ خسرو پرویز دن رات اسی فکر میں رہتا تھا۔ غالبؔ ۔

کشتۂ افعی زلف سیہ شریں کو ب ستوں سبزے سے ہے سنگ زمرد کا مزار

خسرو کا ایک مصاحب شاپور اپنے ایک دوست اور ماہر سنگتراش فرہاد سے اس سلسلہ میں مشورہ لینا چاہتا تھا۔ فرہاد ایک ماہر بت تراش اور علم ہندسہ کا مشہور عالم تھا۔ فرہاد جب قصر شیریں میں گیا تو وہ پہلی ہی نظر میں شیریں پر فریفتہ ہو گیا۔ دو چار بار وہاں آنے

---

(۴) درفش کادیانی:۔

(بتحسین اول بھی صحیح ہے لیکن زبانوں پر بضم اول وفتح ثانی چڑھا ہے)

ایران کے مشہور جھنڈے کا نام ہے جو کاوہ آہن گر کے پیش بند سے بنایا گیا تھا اور ضحاک کے ظلم وستم کے خلاف بلند کیا گیا تھا۔ طبری نے لکھا ہے کہ یہ جھنڈا چیتے کی کھال کا بنا ہوا آٹھ ہاتھ چوڑا اور بارہ ہاتھ لمبا تھا۔ بلعمی کی روایت کے مطابق ایران کے تمام بادشاہوں نے اپنے اپنے دور حکومت میں اس پر اتنے جواہرات لگائے تھے کہ وہ عجوبہ روزگار ہو گیا تھا۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اس پر ایک طلسمی شکل بھی بنی تھی جو فتح وظفر کی علامت تھی۔ مغربیؔ ۔

شاہے کہ بہ رزم کا دیاں داشت درفش

گرزندہ شود پیش تو بردار وکفش

(۵) فرش نو بہار:۔

سلاطین عجم کا ایک مشہور فرش ہے جو سونے کے تاروں سے بنا ہوا اور زمرد و یاقوت سے مرصع تھا یہ جواہرات کی کثرت اور تابندگی سے ہر آن نئے نئے رنگ بدلتا تھا۔ بادشاہ ایام خزاں میں اس پر بیٹھ کر اجلاس کرتے اور شراب نوشی کرتے تاکہ خزاں میں بھی موسم بہار کا لطف حاصل رہے۔

(۶) شبدیز گھوڑا:۔

خسرو پرویز کا محبوب گھوڑے کا نام تھا جس کا قد عام گھوڑوں سے چار بالشت بلند تھا۔

(۷) گنجہائے خسرو:۔

خسرو کے سات خزانے مشہور ہیں جن میں اسی ۸۰ کرور مثقال تو صرف سونا ہی موجود تھا ان

جاری

جانے سے وہ اپنا دل و جان دین و ایمان، زر و مال، عقل ہوش اور علم و ہنر سب کچھ شیریں پر نچھاور کرنے پر تیار ہو گیا۔ شیریں بھی اس وارفتگی کی حوصلہ افزائی کرتی تھی اس طرح اس عشق کا چرچا سارے ملک میں ہونے لگا۔

خسرو پرویز نے پہلے تو فرہاد کو قتل کرانا چاہا لیکن ذلت اور رسوائی کے خوف سے اس نے ایک ایسی چال چلی جس سے فرہاد خود ہی ختم ہو جاتا۔ اس نے یہ شرط رکھی کہ فرہاد کوہ بے ستون کو تراش کر نہر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو شیریں انعام میں اس کو بخش دی جائے گی۔ بظاہر یہ کام انسان دسترس سے باہر اور امر محال تھا۔ غالبؔ ؎

سنجیدنی ہے ایک طرف رنج کوہکن
خواب گران خسرو پرویز ایک طرف

خسرو کو یقین تھا کہ فرہاد اس کام میں اپنی جان دیدے گا یا شریں کے عشق سے ہاتھ اٹھائے گا مگر ایفائے وعدہ کا کہیں موقع نہ آسکے گا۔ غالبؔ ؎

خزانوں کے نام یہ تھے۔ گنج عروس (خسرو کا ذاتی خزانہ) گنج باآورد (وہ خزانہ جو قیصر روم نے کشتیوں میں رکھ کر خسرو کو بھیجا تھا) اس کو گنج آب آورد بھی کہتے ہیں۔ گنج دیتا۔ گنج افراسیاب (توران کی فتح پر ملا ہوا خزانہ) گنج سوختہ بمعنی سنجیدہ۔ گنج خضرا اور گنج ولیہ۔

محمد قلی سلیم ؎

عجب جمعیتے از بوئے زلف او بدست آمد   پریشانی دگر زین گنج باد آور نمی بینم

اشک سالک نیر دی ؎

اگر یک گنج باد آورد خسرو دیدہ در عمرے   مرا صد گنج آب آوردہ ہردم درکنار افتد

فردوسی ؎

دگر نامور گنج افراسیاب   کہ کس رانہ بود آں بخشکی و آب

فردوسی ؎

دگر آنکہ نامش ہمی شنوی   تو گوئی ہمہ ویسہ خسروی

فردوسی ؎

دگر گنج کش خواندہ سوختہ   ازاں گنج شد کشور افروختہ

(۸) طلائے دست افشار:۔ (اس تلمیح کو طلائے دست افشار میں دیکھیں)

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے	بے ستوں خواب گران خسرو پرویز ہے

کوہ بے ستون کو تراشنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن فرہاد دیوانہ وار ایک امید موہوم پر اس کٹھن کام میں جٹ گیا غالبؔ ۔

کوہ کن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب	بے ستوں آئینہ خواب گران شیریں

فرہاد نے عشق کی لگن اور تصور وصال محبوب میں کوہ بے ستون پر تیشہ زنی شروع کر دی بلعمی نے لکھا ہے کہ پتھر کا ایک ٹکڑا جو وہ کھود کر نکالتا تھا وہ اتنا وزنی ہوتا تھا کہ سو ۱۰۰ آدمی مل کر بھی اسے جنبش نہ دے سکیں، اسی طرح سے سالہا سال گزر گئے۔ غالبؔ ۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

فرہاد نے بے ستون پر جگہ جگہ شیریں کے مجسمے تراش لئے تھے وہ ان کو دیکھ کر وصال شیریں کے شگون لیتا۔ کہتے ہیں کہ یہ مجسمے اب بھی بے ستون پر موجود ہیں۔ غالبؔ ۔

کوہ کن نقاش یک تمثال شیریں تھا
سنگ سے سر مار کے ہووے نہ پیدا آشنا

کوہ بے ستون کے پتھروں کی سختی فرہاد کی لگن سے ہار مان گئی اور اس نے سالہا سال کی مشقت بسیار کے بعد سبک دستی کے ساتھ جوئے شیر نکال لی۔ غالبؔ ۔

تکلف بر طرف، فرہاد اور اتنی سبک دستی	خیال آساں تھا لیکن خواب خسرو نے گرانی کی

اب ایفائے وعدہ کا وقت آ پہنچا تھا لیکن خسرو کو شیریں کی فرقت کسی طرح گوارہ نہ تھی۔ اس نے عیاری سے کام لے کر ایک اپنے مصاحب خاص کو بوڑھی عورت کے بھیس میں فرہاد کے پاس بھیجا اور فرہاد کو شیریں کی فرضی موت کی دلخراش خبر سنوائی اس بوڑھی عورت کو تلمیحاً "پیرزن" کہتے ہیں۔ غالبؔ ۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پاؤں	ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

فرہاد نے جب یہ روح فرسا جھوٹی خبر سنی تو اسے سکتہ سا ہو گیا اس نے عالم وارفتگی میں وہی تیشہ اپنے سر پر مار لیا جس سے اس نے کوہ بے ستون تراش کر جوئے شیر نکالی تھی اس طرح اس نے جان شیریں، شیریں پر نچھاور کر دی۔ غالبؔ ۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد	سرگشتہ خمار سوم و قیود تھا

طالب آملی فرماتے ہیں ؎

فرہاد مرداندیشہ شیریں پسراہا	آلودہ بجز دل نہ کنم تیشہ خودرا

اب نہ فرہاد جاں باز باقی ہے اور نہ شیریں سا محبوب دلنواز۔ سب کے سب سپرد خاک ہو چکے ہیں۔ عشق و عشرت کی زندگی گزارنے والا خسرو پرویز بھی اس موت کے پنجہ سے نہ بچ سکا جو مزوں کو کرکراتی ہے اور صحبتوں کو تتر بتر کرتی ہے۔ غالبؔ ؎

سعیِ عاشق ہے فروغ افزائے آب روئے کا	ہے شرار تیشہ بہر تربت فرہاد گل

عمر خضر/عمر جاوداں

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

وحشت درد بے کسی بے اثراس قدر نہیں	رشتہ عمر خضر کو نالہ نارسا سمجھ

عمر خضر کی تلمیح حیات جاوداں اور عمر دوام کے لئے مستعمل ہے کنایۃً درازی عمر کے لئے بھی آتا ہے (خضر بہ کسر اول وسکون دوم و بکسر اول و بہ فتح دوم اور بہ فتح اول وکسر دوم لکھا جاتا ہے اور تینوں طریقے سے صحیح ہے۔)

خضر کے لغوی معنی سبز کے ہیں مشہور ہے کہ چشمہ آب حیات میں غوطہ لگانے سے ان کا رنگ سبز ہو گیا تھا۔اس لئے خضر کے نام سے مشہور ہوئے۔ خضر کے زمانہ کے متعلق بھی متعدد اور مختلف روائتیں مشہور ہیں۔ طبریؔ نے ان کو حضرت ابراہیم کا معاصر لکھا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں شیراز سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر کسی مقام پر پیدا ہوئے تھے کسی نے ان کو فریدوں کے زمانہ میں اور کسی نے سکندر ذوالقرنین کے زمانہ میں بتایا ہے ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ آشیابن آموس کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے ان کی پیدائش کی متضاد روایتوں کی ایک وجہ ان کی طویل العمری بھی ہو سکتی ہے۔

قرآن شریف میں خضر کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ صرف، عبد صالح، کا ذکر ہے جس کے متعلق مفسرین نے مختلف اندازے لگائے ہیں۔ ایک دن حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل

کو خطاب کرتے ہوئے خود کو اس زمانہ کا سب سے بڑا عالم ظاہر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے مجمع البحرین (جہاں دو سمندر ملتے ہیں) جاکر عبد صالح سے ملنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت موسیٰ نے وہاں جاکر اس عبد صالح سے ملاقات کی اور اٹھارہ ماہ تک اس کے معاشر و مصاحب رہ کر خصوصی تعلیم حاصل کی عام طور سے اسی عبد صالح کو خضر سمجھا جاتا ہے یہ بات بھی صاف نہیں ہے کے وہ عبد صالح نبی تھا یا نہیں یا اس کا نام خضر تھا یا نہیں اگر اس کا نام خضر بھی تھا تو یہ حیات دوام والے خضر ہیں یا کوئی اور۔ بہر حال عام طور یہی مشہور ہے کہ یہ عبد صالح پیغمبر اور حیات دوام والے خضر ہی تھے۔ اُردو و فارسی ادب میں ان کا کام خشکی کی رہنمائی مصیبت زدوں کی مدد اور بھولے بھٹکوں کو راستہ بتانے کا سمجھا جاتا ہے

غالبؔ ؎

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالبؔ	عصائے خضر صحرائے سخن میں خامہ بیدل کا

سیر آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

حافظ ابن حجر عسقلانی کی راویت کے مطابق آنحضرت صلعم اور خضر کی ملاقات بھی تین بار ہوئی تھی۔

عام طور پر خضر کو سکندر ذوالقرنین کا وزیر اور مشیر بتایا جاتا ہے اور آب حیات و چشمہ ظلمات کے بے شمار قصے ان سے منسوب کئے جاتے ہیں جن کا خلاصہ یہ کہ سکندر ذوالقرنین آب حیات کے چشمہ تک کی خضر کی رہنمائی میں گیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے دونوں گھور اندھیرے کے ایک مقام ظلمات سے گذرے تھے آب حیات کے چشمہ پر پہنچ کر خضر نے تو اسے پی کر حیات جاوداں پائی اور سکندر اس محروم رہا (سکندر اور خضر کی تلمیح بھی دیکھئے) غالبؔ ؎

مشتق نقش قدم، نسخہ آب حیواں
جادۂ دشت نجف عمر خضر کا طومار

مشہور ہے کہ خضر اب لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر قیامت تک زندہ رہیں گے۔ غالبؔ ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اُردو اور فارسی ادب میں حضرت خضر کے لئے بے شمار قصے، کہانیاں اور دوسری بے سروپا روائتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ان کا قیام ایک جزیرے میں ہے جہاں وہ ہر وقت خدا کی یاد اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اسی حیثیت سے ان کو بحری مدد گار سمجھا جاتا ہے۔ بحری طوفانوں کے موقعوں پر اکثر ان کو ساحل پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ ان کا جہاں بھی قدم پڑے وہاں سبزہ پیدا ہو جاتا ہے اور جس مقام سے گزر جائیں وہ ہمیشہ کے لئے سر سبز و شاداب ہو جاتا ہے مرزا رضی دانش فرماتے ہیں ۔

زخاک بزم مستاں خرمی چوں سبزہ می روید	بہار دلکشائے خضر مینا در قدم دارو

اس حیثیت سے خضر کو مبارک قدم، نیک پے "خجستہ پے بھی کہا جاتا ہے۔

مرزا صائب ۔

چوں نگردد سپر در میداں جاں بازان عشق
نیست خضر نیک پے گر شرمسار زندگی

ہندوستان میں "خضر کو خواجہ کے" نام سے ہر مصیبت کے وقت پکارا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ آسمان، زمین اور سمندر ہر جگہ ان کو اختیار حاصل ہے۔ وہ ہوا میں اڑ سکتے ہیں پانی پر چل سکتے ہیں۔ ہر سال حج کے لئے مکہ کا سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اندر پانی دریافت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ملک اور قوم کی زبان سے واقف ہیں ان کو کوئی انسان سمجھتا ہے اور کوئی پیغمبر کوئی فرشتہ کہتا ہے اور کوئی ولی قرار دیتا ہے یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر مصیبت کے وقت ان کو تین بار پکارا جائے تو وہ لوگوں کو چوری، آگ،۔ بادشاہوں کے ظلم، شیطانوں کے غریب حشرات الارض کے نقصان سے محفوظ رکھتے ہیں ان ساری روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ "وہ قیامت تک زندہ رہیں گے" غالبؔ ۔

جہاں مٹ جائے سعی دید خضر آباد ستائش	یہ جیب ہر نگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا

عنقا

(اس کا صحیح تلفظ بہ فتح اول ہے اور بضم غلط ہے۔اس کا ماخذ عنق یعنی گردن ہے)

عنقا ایک معلوم الاسم اور مجہول الجسم پرندکا نام ہے جو اپنی لمبی گردن یا گردن پر سفیدی کی وجہ سے مشہور ہے اس نام کی بنیاد بائبل کا لفظ عناقیم بھی ہو سکتی ہے۔اس راویت میں جو شکل بنائی گئی ہے اس کا جسم عقاب کا اور صورت شیر کی سی ہے۔اس پرند کو آج تک کسی نے دیکھا نہیں ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بہت قدیم زمانے میں پایا جاتا تھا اب اس پرند کا اطلاق معدوم، کمیاب اور نادر الوجود چیزوں کے لئے ہوتا ہے۔غالب

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے	جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں اس پرند کے متعلق دلچسپ واقعات لکھے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

عبداللہ بن یافعی نے مراۃ الخیال سے نقل کیا ہے کہ اصحاب الرس کی آبادی کے قرب ایک پہاڑ پر ایک پرند ایسا بھی آگیا تھا جس کا منہ انسان کا اور اعضاء مختلف جانوروں کے تھے۔ساکنان اصحاب الرس اس کو عنقائے مغرب کہتے تھے۔جب اس پرند نے بہت تنگ کیا تو لوگوں نے اپنے پیغمبر حیظل بن صفوان سے دعا کرا کے اس عذاب سے نجات حاصل کی کہتے ہیں کہ وہ پرند پھر کبھی نظر نہ آیا۔

مورخ فرغالی نے لکھا ہے کہ ایک بار شمالی مصر میں ایک عظیم الجثہ پرند آگیا تھا جس کی ڈاڑھی اور غبغب انسان سے مشابہ تھا اور اس کے اعضا طرح طرح کے جانوروں کے اور مختلف رنگوں کے تھے وہ پرند جب عزیز مصر کے سامنے پکڑ کر لایا گیا تو لوگوں نے اس کا نام عنقا بتایا تھا۔

مشہور لغت نگار ویبلسٹر نے لکھا ہے کہ اس خیالی جانور کا جسم عقاب کا اور صورت شیر کی سی ہوتی ہے۔اس کے دو بازو ایک چونچ اور چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔اس کی تصویریں زمانہ قدیم کے تمغوں اور زرہ بکتروں پر پائی جاتی تھیں۔ایک روایت یہ ہے کہ یہ پرند ساری دنیا میں ایک ہی ہوتا ہے۔پانچ چھ سو سال زندہ رہتا ہے جب یہ بوڑھا ہوتا ہے تو خود کو آگ میں جلا کر بھسم کر لیتا ہے پھر اسی خاک سے دوسرا عنقا جنم لیتا ہے۔غالب

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا　　میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

فارسی میں اسی پرندکو "سیمرغ" کہاجاتا ہے جس سے زال اور رستم کے بہت سے قصے منسوب ہیں لیکن شاہنامہ کے مطابق سیمرغ کے بچے بھی ہوتے ہیں اس لئے آگ سے جل کر بھسم ہو جانے والی بات اس پر صادق نہیں آتی ہے۔ غالبؔ ۔

خیال سادگی ہائے تصور نقش حیرت ہے　　پرِ عنقا پہ رنگِ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں

عید شوال

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

مرحبا سال فرخ آئیں	عید شوال وماہ فروردیں

عید شوال رمضان کے خاتمہ پر منایا جانے والا مشہور تہوار ہے جس کو "میٹھی عید" "عید صغیر" اور "عید الفطر" بھی کہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا جشن مسرت ہے فطرہ دیا جاتا ہے۔

عید کے لفظ کی بنیاد "عود" بمعنی بازگشت، واپسی، مراجعت اور پلٹنے کے ہیں۔ منتخب اللغات اور صراح کے مطابق عید کا تہوار چونکہ برس کے برس دن عود کرتا ہے اس لئے عید کے نام سے مشہور ہوا یا اس تہوار میں خوشی اور مسرت عود کرتی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ آرامی لفظ ہے۔ سریانی میں چھٹی کے دن کو "عیدا" کہا جاتا ہے۔

مُلّا نسبتی تھانسیری فرماتے ہیں ۔

شد شام و بذیدیم رخ او آہ ندیدیم
فردا نکنم عید کہ شب ماہ ندیدیم

یہ عید تین دن تک چلتی ہے۔ مسلمانوں میں نئے اور صاف کپڑے پہن کر خوشبو لگائی جاتی ہے ایک دوسرے کے گھر جا کر عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ دعوتیں اور رقص وسرود کی محفلیں جمتی ہیں۔ عید کے دن مسجدوں اور خصوصاً عید گاہ میں دوگانہ عید ادا کیا جاتا ہے۔

حکیم زلالی فرماتے ہیں ۔

دوگیتی عید گاہ آفتابش	شہید غمزۂ حاضر جوابش

غرورِ میرزائی

"میرزا" کی اصل امیر زا ہے یعنی امیر زادہ، رئیس زادہ اور شاہ زادہ، پہلے یہ لقب بادشاہوں اور شہزادگان کے لئے مخصوص تھا۔ ہندوستان میں عموماً شاہی خاندان کے لوگ اپناتے تھے مگر بعد کو عام مغل بھی اپنے نام کا جز بنانے لگے۔ غرور میرزائی سے مراد بوئے حکومت اور نشۂ سرداری ہے۔ میرزا غالب کا شعر ہے ؎

کروں عذر ترکِ صحبت، سو کہاں وہ بد دماغی
نہ غرور میرزائی، نہ فریب نا توانی

ہندوستان میں مرزا لکھنے کا رواج نادر شاہ دُرّانی کے حملے کے وقت سے ہوا تھا نادر شاہ نے جب اقتدار حاصل کر لیا تو ہر مغل شاہزادہ اپنے کو میرزا کے لقب سے ممتاز کرنے لگا اُردو میں "میرزا منش" طنزاً نازک دماغی، شاہانہ مزاجی اور تکبر کے معنوں میں مستعمل ہے۔

غمِ شبّیر / شہید کربلا

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

غم شبّیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز	کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں

غم شبیر سے مراد سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے غم سے ہے۔ شبیر یا شبیر حضرت امام حسینؑ کا لقب ہے۔ یہ شبر کی تصغیر ہے جس کے معنی نیک اور اچھے کے ہیں۔ دراصل شبر۔ شبیر اور مشبر حضرت ہارونؑ کے تین بیٹوں کے سریانی نام تھے اس لئے نہ آنحضرت صلعم بھی پیار سے اپنے نواسوں کو ان ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ اس تلمیح کا اشارہ اس حادثۂ عظیم کی طرف ہے جب ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کو حضرت امام حسینؑ یزید ابن معاویہ کے حکم سے کربلا کے میدان میں شہید کر دیے گئے تھے۔

حضرت امام حسینؑ آنحضرت صلعم کے محبوب ترین نواسے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت ہجرت کے پانچویں سال مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ امیر معاویہ ابن ابو سفیان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا یزید (۶۴۲۔۶۸۳ء) تخت سلطنت پر بیٹھا تھا۔ یہ شخص بدکاری، بے دینی اور فسق و فجور میں شہرہ آفاق تھا اس نے

تخت پر بیٹھتے ہی ظلم و ستم شروع کر دیئے۔ مدینہ منورہ میں حضرت امام حسینؑ اور ایک مشہور صحابی عبداللہ بن زبیر نے یزید جیسے فاسق و فاجر کی خلافت تسلیم نہ کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ مکہ کی سکونت اختیار کر لی تھی اور گوشہ تنہائی کی زندگی گزارنے لگے۔ دوسری طرف یزید کے ظلم و ستم سے کوفے والے بہت پریشان ہو گئے تھے اور وہ حضرت امام حسینؑ کو اپنی رہنمائی کے لئے برابر بلا رہے تھے۔ آپ کو بلانے کے لئے کوفے سے بے شمار خط اور متعدد وفود آئے کہ آپ کوفہ چل کر خلافت قبول فرمالیں۔ یزید نے جب یہ خطرہ محسوس کیا تو اس نے عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کر کے، حکم دیا کہ حضرت امام حسینؑ سے زبردستی بیعت لی جائے۔ حضرت امام حسینؑ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو دریافت حال کے لئے کوفہ روانہ کیا۔ شروع میں تو کوفے کے ہزاروں آدمیوں نے حضرت مسلم کے ہاتھوں بیعت لی اور جاں نثاری کے وعدے کیے لیکن جب حضرت مسلم شہید کر دیئے گئے تو کوفے والے بھی منحرف ہو گئے۔ حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سے پہلے ہی امام عالی مقامؑ کوفے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ آپ کو راستہ میں جب یہ خبر ملی تب بھی آپ نے یہ سفر جاری رکھا اور یہ قافلہ ۲؍ محرم سنہ ۶۱ھ کو کربلا کے میدان میں پہنچ کر نہر فرات کے کنارے ٹھہر گیا۔ دوسری طرف یزیدی لشکر بھی عمر سعد کی سرکردگی میں وہاں پہنچا اور اس نے ناکہ بندی کر کے لشکر امام پر پانی بند کر دیا۔ ۱۰؍ محرم سنہ ۶۱ھ کو تیس ہزار یزیدی فوج سے امام عالی مقامؑ اور ان کے بہتر ساتھیوں کا مقابلہ ہوا۔ دوپہر تک سارے جاں نثاروں نے جام شہادت نوش کر لیا حضرت امام کے جوان بیٹے علی اکبر شہید ہوئے۔ چھ ماہ کے معصوم بچہ نے آغوش پدر میں حرملہ کے تیر ستم سے شہادت پائی۔ جاں نثار اور برابر کے بھائی عباس نے آنکھوں کے سامنے دم توڑا۔ کڑیل جوان قاسم نے چچا کی گود میں جنت کی راہ لی۔ آخر میں جب امام عالی مقامؑ تنہا رہ گئے تو سنان بن انس کے تیر سے آپ زمین پر گرے اور خولی یا شمر نے سجدہ میں سر اقدس کو تن سے جدا کر دیا۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر ۵۶ سال ۵ ماہ اور ۵ دن تھی حضرت امام حسینؑ کو شہید کربلا بھی کہا جاتا ہے۔ غالبؔ

وہ جس کے ساتھیوں پر ہے سلسبیل سبیل	شہید تشنہ کربلا کہیں اس کو

فتنۂ محشر / قیامت

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم	میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

فتنۂ محشر کنایۂ قیامت کو کہتے ہیں۔ محشر کے معنی شور و غل، غوغا اور اٹھنے کے ہیں اور قیامت کے لغوی معنی بھی امر عجیب کے ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں حشر، محشر اور قیامت اس دن کو کہتے ہیں جب عجیب و غریب واقعات ہوں گے۔ اس دن ساری بساط ہستی الٹ جائے گی اور نظام کائنات درہم و برہم ہو جائے گا۔ حیات موجودہ مکمل تباہ ہو جائے گی توراتؔ اور انجیل میں اس کو 'روز عدالت' اور ہندو روایتوں میں "پرلے" کہا گیا ہے۔ غالبؔ ۔

ہے سوا نیزے پہ اس کے قامت نو خیز سے	آفتاب صبح محشر ہے گل دستار دوست

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے لیکن اس کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہے قرآن مجید اور احادیث میں اس دن کی کچھ علامتیں ضرور دی گئی ہیں۔ امام احمد نے مسند میں، امام مسلم نے صحیح میں، اصحاب سنن نے سنن میں یہ روایت قیامت کے متعلق ایک حدیث نبوی نقل کی ہے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق کچھ گفتگو کر رہے تھے کہ آنحضرت صلعم نے بالا خانے سے جھانکا اور فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم یہ دس نشانیاں نہ دیکھ لوگے۔ (۱) آفتاب کا مغرب سے طلوع۔ (۲) دُخان یعنی دھواں (۳) دابۃ الارض (۴) یاجوج و ماجوج کا خروج (۵) عیسیٰ بن مریم کا نزول (۶) دجال کا ظہور (۷) تین مقامات یعنی مشرق، مغرب اور جزیرۃ العرب میں خسوف کا پیش آنا (۸) آگ کا قعر عدن سے نکلنا (۹) جو لوگوں کو سمیٹ کر لے جائے گی اور (۱۰) جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ ٹھہر جائے گی اور جب لوگ دوپہر کا قیلولہ کریں گے جب بھی ٹھہری رہے گی۔ غالبؔ ۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

قیامت کی تفصیل قران مجید کی مختلف سورتوں میں بیان کی گئی ہے ان تمام آیتوں

کا خلاصہ یہ ہے ۔"اس دن نرسنگھا پھونکا جائے گا جس کی پہلی آواز سے ہر ذی نفس کی موت ہو جائے گی اور دوسری آواز سے پھر سے زندہ ہو کر قبروں سے نکل آئیں گے (انعام، نحل، توبہ) ہر قوم کے لوگ اکھٹے ہو جائیں گے (نمل ۔۷) اور جہان کے پرودگار کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے (مطففین۔۱) صور (نرسنگھا) کی ندا ہو گی "لمن الملک الیوم" یعنی اس دن کس کی بادشاہت ہے اس کا اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا لللہ الواحد القہار یعنی اس ایک کی جو سب پر غالب ہے (قارعہ۔۱) آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اپنے مالک کی فرماں برداری کریں گے جس کے وہ لائق ہے اور زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ اس کو ڈالدے گی (شگافوں میں) اور خالی ہو جائے گی (انشقاق۔۱) ستارے بکھر جائیں گے اور سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی (انفطار۔۱) آفتاب بے نور کیا جائے گا اور ستارے ماند پڑ جائیں گے ۔(مرسلات۔۱) آفتاب اور ماہتاب دونوں اکھٹے کر دئے جائیں گے (قیامہ۔۱) اور گواہ کھڑے ہوں گے (مومن۔۶) ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی (انور۔۳)۔نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد (شعراء۔۵) آدمی اپنے بھائی، ماں، باپ اور بیوی بچوں سے بھاگے گا (نمل۔۷) کوئی کسی کا بدلہ نہ بن سکے گا (بقر۔۶۔۱۵) سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی (مائدہ۔۱۶) اور گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائیں گے (فرقان۔۳) جس کسی نے ذرّہ بھر بھی نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بھی بدی کی ہے وہ اس کو بھی دیکھ لے گا (زلزال۔۱) مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا (مریم۔۴) بیشک تیرا پروردگار بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (اعراف۔۱۹) غالبؔ

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں	شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

غالبؔ ؎

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

فرشتہ

مرزا غالبؔ کا شعر ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کو لکھے پر ناحق
آدمی کوئی بھی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اس شعر میں فرشتوں سے مراد کاتب اعمال ہیں۔ یہ فرشتے انسانی اعمال وافعال کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ ان کو کراماکاتبین اور اخبار کے فرشتے بھی کہا جاتا ہے ان فرشتوں کے ذریعہ جو رکاڈ تیار ہوتا ہے اس کو صحیفۂ اعمال اور نامۂ اعمال کہتے ہیں۔

فرشتہ (بہ کسر اول ودوم) کی اصل فرستہ ہے جو فرستادن کا اسم مفعول ہے اصطلاحی معنوں میں فرشتہ خدا کے نورانی قاصد کو کہتے ہیں کنایۃً معصوم، متقی اور پرہیزگار آدمی کو کہا جاتا ہے ایسے شخص کے لئے فرشتہ خو، فرشتہ خصال، فرشتہ منش اور فرشتہ سرشت بھی مستعمل ہے امیر خسرو ۔

ناصردیں شاہ فرشتہ سرشت
خوئے خوشت نسخہ باغ بہشت

سعدیؔ فرماتے ہیں ۔

فرشتہ خوئے شود آدمی زکم خوردن
دگر خورد چوں بہائم بیوفتد چوجماد

فرشتہ کے لئے قرآن مجید میں ملک بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں اسی لئے ملائکہ کے لئے رُسل کا لفظ بھی آیا ہے۔ دنیا کے تمام قدیم اور جدید مذہبوں میں فرشتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یونانی اور مصری فلسفہ میں ان کا نام عقول عشرہ رکھا گیا ہے۔ پارسیوں میں فرشتہ کو "امشاسند" کہا گیا ہے یہودیوں میں ان کو "کروبیم" کہتے ہیں۔ عرب میں پہلے (زمانہ جاہلیت میں) ان کو "خدا کی بیٹیاں" کہا جاتا تھا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق فرشتے نہ مرد ہیں نہ عورت۔ وہ معصوم ہیں یعنی ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ تمام فرشتوں کا کام خدا کی تسبیح و تہلیل کرنا ہے وہ دوسرے تمام بشری لوازم سے بے بہرہ ہیں جیسے کھانا، پینا، ہنسنا بولنا وغیرہ۔ ان سب فرشتوں کے فرائض الگ الگ اور مختلف ہیں اسی طرح ان کی اقسام بھی جدا ہیں۔

آج کل کی موجودہ سائنس نے بھی یہ اصول تسلیم کر لیا ہے ہر وہ آواز جو کبھی پیدا ہوئی تھی آج بھی زیر آسمان موجود ہے چاہے لاکھوں برس کا زمانہ گزر چکا ہو اسی طرح کوئی بھی حرکت کبھی فنا نہیں ہوتی ہے قرآن مجید نے بھی اس کلیہ کو متعدد آیتوں میں بیان کیا ہے جیسے سورہ یونس ۳۔۷ سورہ ق۔ ۳ سورہ اسرائیل۔۲۔ اور سورہ کھف۔۶۔ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ، دماغ میں آیا ہوا ہر خیال اور جسم کی ہر حرکت چاہے کتنی ہی تنہائی میں سرزد ہوئی ہو فوراً نوٹ کر لی جاتی ہے۔ خدائی شاہد اس کو سننے، دیکھنے اور لکھنے کے لئے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ہر انسان پر دو فرشتے مقرر ہیں جو اس کے دائیں اور بائیں کندھے پر تعینات ہیں۔ جب قیامت کے دن میزان حساب کھڑی ہو گی اور تو یہ حساب کے فرشتے ہر شخص کا نامہ اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کریں گے پھر گناہ گار دیکھیں گے کہ کوئی بھی چھوٹی بڑی بات اس میں چھوٹی نہ ہو گی۔ اس وقت انکار، تردید، بہانہ، بحث اور حیلہ شرعی کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔

فرعونِ بے ساماں

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

اسدؔ یہ عجز و بے سامانئ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعوا ہے خدائی کا

فرعون قدیم شاہان مصر کا لقب ہے اس کے لغوی معنی نہنگ کے ہیں اور اس کی جمع فراعنہ ہے۔ اُردو میں عام طور پر اس بادشاہ کو فرعون کہا جاتا ہے جو حضرت موسیٰ کا ہمعصر تھا۔ اسی لئے فرعون کے مجازی معنی سرکش، ظالم، متکبر اور نافرمان کے ہیں۔ فرعون بے ساماں کنایۃً چھچھورے اور گھمنڈی انسان کو کہتے ہیں۔

مصر میں فرعونوں کے اکتیس ۳۱ خاندانوں نے حکومت کی تھی۔ یہ بادشاہ خود کو ”آمن راعؔ“ (سورج دیوتا) کا اوتار سمجھتے تھے۔ راعؔ کا اوتار ہونے کی وجہ سے ان کا نام فاراعؔ ہو گیا جو عبرانی میں فارعن اور معرب ہو کر فرعون بن گیا۔ حضرت موسیٰ کا ہمعصر فرعون خاندان عمالقہ سے تھا جو فراعنہ مصر کا انیسواں ۱۹ خاندان تھا۔ مصر کی تاریخ میں اس کو ہیکسوس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جدید حجری کتبات اور مصری اثریات کی چھان بین سے

اس فرعون کا نام "منفتاح بن ریمسس" معلوم ہوا ہے اس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے ۱۲۲۵ ق م تک بتایا جاتا ہے۔ مرزا غالب نے فرعون بے ساماں کی تلمیح سے اسی فرعون کے عجز و بے چارگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک طرف تو وہ خدا ہونے کا دعویدار تھا اس کے حکم کے بغیر مصر میں پتہ تک نہیں ہل سکتا تھا دوسری طرف جب وہ بحر احمر میں مع اپنے لشکر کے غرق ہونے لگا تو اس نے عام بے چارگی میں کہا تھا "میں بھی اس خدا پر ایمان لاتا ہوں جو بنی اسرائیل کا ہے۔ میں بھی اسی خدا کا بندہ ہوں" وہ دنیوی شوکت و سطوت، عزت و حکومت اور جاہ و جلال سب ختم ہو چکا تھا ایک بے بس اور مجبور بندہ اپنے اعمال بد پر پشیمانی کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس وقت تک رسی کی درازی ختم ہو چکی تھی اس کی پکار کا بارگاہ الٰہی سے یہ جواب ملا کہ "آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کے لئے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے تاکہ وہ عبرت کا نشان بنے"۔ فرعون اس وقت حضرت موسیٰ کا تعاقب کرتا ہوا بحر احمر کے وسط میں تھا۔ جب موسیٰ اور ان کی ساری قوم خشک زمین کی مانند بحر احمر کو پار کر گئے تو وہ بحری راستہ خود بخود اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون مع اپنے تمام لشکر کے سمندر میں غرقاب ہو گیا۔

منفتاح کی لاش مصری عجائب خانہ میں اب بھی رکھی ہوئی ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے "اے سرکش اور مغرور انسانوں مجھ سے عبرت پکڑو" اس فرعون کو ذلت اور رسوائی سے بچانے کے لئے مصر کے قدیم باشندوں نے بہت کوشش کی تھی انھوں نے اس کی لاش کو اٹھارہویں خاندان کے فرعون "امنحتب" کے مقبرے میں رکھا تھا حالانکہ مصری دستور کے مطابق ہر خاندان کا مقبرہ علاحدہ ہوتا ہے۔ منفتاح کی لاش پھر بھی تلاش کر لی گئی اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی ناک غائب ہے جو شاید بحر احمر کے کسی جانور نے کھالی ہو۔

فغفور

مرزا غالب کا شعر ہے۔

زندگانی پہ اعتماد غلط	ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

فغفور چین کے بادشاہوں کا قدیم لقب ہے۔ فغ یا بغ کے معنی بت کے ہیں یا دیوتا کا نام ہے۔ فور اور پور بیٹے کو کہتے ہیں۔ اس طرح فغفور کے معنی "بت کا بیٹا" ہوئے۔ مشہور

ہے کہ چین میں کسی بادشاہ نے اپنے بیٹے کو بت پر چڑھادیا تھا یعنی منت کے مطابق بُت کے نام کردیا تھا۔ ایران کے لوگوں نے اصل چینی لفظ Tien-tso کا ترجمہ کر کے فغفور کردیا۔ عرب میں اس کو بغبور بھی کہا جاتا ہے۔

(قیصر روم کی تلمیح بھی دیکھیں)

فریدوں و جم و کیخسرو، داراب و بہمن

مرزا غالب کا شعر ہے

مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب	فریدوں و جم و کیخسرو، داراب و بہمن کو

یہ تمام نام شاہان ایران کے ہیں جن کا تعلق وہاں کے قدیم قومی افسانے سے ہے۔ ان کا مختصر تعارف اس طرح ہے۔

(ا) فریدوں :

یہ پیشدادی سلسلہ کا چھٹا بادشاہ تھا جس نے ضحاک [1] کو ختم کر کے پانچ سو ۵۰۰ سال تک حکومت کی تھی۔ بعض لوگ اس کو ذوالقرنین اصغر اور بعض ذوالقرنین اکبر کہتے ہیں۔ ملا فیضی سہرندی نے لکھا ہے کہ فریدوں حکیم تھا اور شراب اسی نے ایجاد کی تھی بہر حال فریدوں کلمہ تحسین فری اور کلمہ نسبت دوں سے مرکب ہے اور یہ فری مخفف آفرین کا ہے۔ اس بادشاہ کی حکمت اور دانائی کے قصے ایران کے قومی ادب کا ایک اہم جز ہیں۔ خواجہ

---

[1] : ۔ضحاک کے معنی ہنسانے والے کے ہیں اس کی پیدائش کے وقت تمام دانت موجود تھے اس لیے یہ نام رکھا گیا یہ بھی روایت ہے کہ ضحاک معرب ہے "دہ آک" کا یعنی مجموعہ دس عیوب۔ ضحاک کے یہ دس عیب مشہور ہیں یعنی زشت روئی۔ کوتاہ قدی۔ بیدادگری۔ دروغگوئی۔ بے دینی۔ بسیار خوری۔ بے حیائی۔ بدزبانی۔ جلد بازی۔ نخوت۔ وتکبر۔ حکیم قسطران فرماتے ہیں بداندیش تو وہ آک است دوہاک، توئی خسرو دی یکروئی فریدوں، ضحاک پیشدادی سلسلہ کا مشہور معروف ظالم وجابر بادشاہ تھا جو جمشید کی نسل سے یا شداد کا بھائی تھا۔ اہل شام نے اس کو ہی نمرود لکھا ہے فردوسی کے بیان کے مطابق ضحاک نے شیطان کے ورغلانے پر باپ کو قتل کر کے اپنی ماں سے شادی کر لی تھی اس بات پر خوش ہو کر شیطان نے اس کے دونوں کاندھوں پر بوسہ دیا تھا اس بوسے کے اثر سے اس کے دونوں کاندھوں پر دو سانپ نکل آئے تھے جو "ماران ضحاک" کہلاتے ہیں۔ یہ سانپ دو انسانوں کا بھیجا روزانہ کھاتے تھے۔

نظامی فرماتے ہیں۔ ؎

ولایت ستاں شاہ گیتی پناہ	فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ

کہتے ہیں کہ فریدوں طہورث دیوبند کی نسل سے تھا اس کے باپ کو ضحاک نے قتل کرادیا تھا اور شاہی نسل سے سوائے فریدوں کے کوئی نہ بچا تھا۔ فریدوں کو خفیہ طور پر ایک دہقان نے پالا اور سرمایہ گائے کے دودھ سے اس کی پرورش کی۔ فریدوں جب جوان ہوا تو اس نے کاوہ آہن گر کے ساتھ مل کر درفش کادیانی (مشہور جھنڈا) کے ساتھ ضحاک کو قتل کیا اور اپنے آباءواجداد کی سلطنت واپس لی۔

(۲) جم :

یہ پیشدادی سلسلہ کا چوتھا اولوالعزم اور مشہور ترین بادشاہ تھا۔ اوستا کے مطابق یہ "ویون ہاؤ" کا بیٹا تھا۔ بعض مورخین نے اس کو ابن سام یا شیم بن نوح قرار دیا ہے۔ مشہور مورخ جان مالکم کے نزدیک یہ طہورث دیوبند کا بھتیجا تھا۔ پہلے اس کا نام صرف جم تھا لیکن آذربائی جان کے جشن نوروزی کے موقع پر شید بمعنی شعاع کا اضافہ کر کے جمشید کے نام سے مشہور ہوا (تفصیل نوروز کی تلمیح میں دیکھیں)

جمشید کے زمانہ میں حجری دور ختم ہوا تھا۔ اس نے خدائی کا دعوا بھی کیا تھا۔ پارسی لوگ تو اس کو پیغمبر سمجھتے ہیں۔ ایرانی مورخین اور مصنف چار چمن کے نزدیک جمشید اور سلیمان ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں مگر پروفیسر براؤن نے اس قول کی تردید کی ہے۔ ان دونوں بادشاہوں کے بہت سے خصائص ملتے جلتے ہیں بہر حال جب مہر آبگیں، مور، دیو پری، وحوش وطیور کا ذکر ہو تو اس سے مراد حضرت سلیمانؑ سے ہی ہوتی ہے اور جب جام کا ذکر ہو تو جمشید سے مراد لی جاتی ہے۔ عبدالواسع جبلی فرماتے ہیں ؎

نخشمت عدو را قہرمان، مہرت متاع الانس وجان
گوئی کہ ایں وآں بودچوب کلیم و مہر جم

(۳) کیخسرو :

یہ کیانی خاندان کا نامور بادشاہ تھا۔ اس کو سیاؤش کا بیٹا اور کیکاؤس کا پوتا لکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کیکاؤس کا بیٹا سیاؤش اپنی سوتیلی ماں سدابہ کے خراب طرز عمل سے تنگ آکر توران چلا گیا تھا۔ وہاں کا والی افراسیاب ایران کا ازلی دشمن تھا اس نے سیاؤش کو ہاتھوں ہاتھ لیا

اور اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کر دی۔ تھوڑے دن کے بعد سیاوش کو بے گناہ قتل کرادیا۔ اپنے باپ کے خوف سے سیاوش کی بیوی نے راہ فرار اختیار کی جو اس وقت حاملہ تھی اس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام کیخسرو رکھا گیا اور وہ اپنے کیکاؤس کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھنے لگا۔ کیکاؤس کی موت کے بعد جب ایرانی سلطنت کیخسرو کو ملی تو اس نے اپنے نانا افراسیاب سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لیا اور توران پر قبضہ کر کے سلطنت کی باگ ڈور اس نے لہراسپ کو سونپ کر خود روپوش ہو گیا۔ ایران کے لوگ کیخسرو کو پیغمبر سمجھتے ہیں اور آج تک اس کا نام عزت و توقیر سے لیتے ہیں۔ ادب میں "خون سیاوش" کی تلمیح بھی مستعمل ہے۔
خواجہ عمید لوکی فرماتے ہیں ؎

صبح دمید ساقیا توبہ چو زلف در شکن	خیزد بجام خسروی خون سیاوشان فکن

(۴) داراب:

یہ ایران کا مشہور و معروف بادشاہ ہے جو کئی جنگوں کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے اس نے فیلقوس والئ مقدونیہ کو اس قدر عاجز اور مجبور کر دیا تھا کہ ہر سال ایک ہزار سونے کے انڈے خراج میں داخل کیا کرے اور اپنی بیٹی کو اس کے محل میں داخل کرے۔ فیلقوس کی اسی بیٹی کے بطن سے مشہور فاتح اعظم سکندر پیدا ہوا۔ داراب کا باپ اردشیر دراز دست یعنی بہمن تھا۔ داراب کی ماں سے اس کے ہی باپ نے شادی کر لی تھی یعنی باپ نے بیٹی سے شادی کی تھی اس طرح داراب کا باپ اس کا حقیقی نانا بھی تھا۔ غالب ؎

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام	اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

(۵) بہمن:

ایران کا یہ بادشاہ اردشیر دراز دست کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے دونوں ہاتھ گھٹنوں تک آتے تھے اس لئے بہمن کہلاتا ہے جس کے لغوی معنی بھی دراز دست کے ہیں۔
منوچہر فرماتے ہیں ؎

شنیدم من کہ برپا ایستادہ
رسیدہ تابہ زانو دست بہمن

بہمن اسفندیار روئیں تن کا بیٹا تھا۔ باپ کا انتقام لینے کے لئے بہمن نے سیستان پر

بھی حملہ کیا تھا لیکن اس وقت تک رستم اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ جان مالکم نے لکھا ہے بہمن کے بعد اس کی بیٹی ہما تخت پر بیٹھی تھی جو اپنے باپ سے حاملہ تھی اسی کے بطن سے داراب پیدا ہوا تھا۔

قیصر روم اور مرشد جام

مرزا غالب کا شعر ہے

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم	جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

قیصر روم کے پہلے بادشاہ اعنطوس کا لقب ہے۔ لاطینی زبان میں قیصر ایسے بچہ کو کہتے ہیں جو ماں کے مرتے وقت شکم چیر کر نکالا گیا ہو اس لئے اعنطوس بھی اس لقب سے مشہور ہوا اس کے بعد تو قیصر بازنطینی بادشاہوں کا لقب ہو گیا جیسے مصر کے بادشاہ فرعون اور چین کے بادشاہ فغفور کہلاتے تھے۔

قیصر کا نام قرآن مجید میں نہیں آیا ہے لیکن اسلامی تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر موجود ہے اس کا شمار دنیا کے بڑے بادشاہوں میں ہوتا ہے اور ایران کے بادشاہ کسریٰ کے ساتھ اکثر یہ نام لیا جاتا ہے۔ آخر زمانے کے شعرا نے اس نام کو شان و شوکت اور صولت و حشمت کے نشان کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اُردو اور فارسی شعرا جب اس نام کو استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ قیصر روم ہوتا ہے جس کے پاس آنخضرت صلعم نے دعوت اسلام کے لئے ایک صحابی دحیۃ الکلبی کو بھیجا تھا اور ان کے ساتھ اپنا نامہ مبارک بھی روانہ کیا تھا۔ قیصر نے اس نامہ مبارک کو پڑھنے کے لئے کسی عرب کو تلاش کیا تھا اتفاقاً اس زمانہ میں ابوسفیان تجار عرب کے ساتھ غزۃ میں مقیم تھے۔ ابوسفیان سے گفتگو کرنے کے بعد قیصر نے کہا تھا "مجھے یہ خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر میں وہاں جاسکتا تو اس نبی کے پاؤں دھوتا"۔

قیصر اور ابوسفیان کی پوری گفتگو مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے سیرت النبی جلد اول میں صحیح بخاری شریف کے متعدد ابواب کے حوالوں سے نقل کی ہے۔ مولاناؒ نے یہ بھی لکھا ہے "گو اس کے (قیصر کے) دل میں نور اسلام آچکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ

روشنی بجھ گئی"۔ عہد خلافت فاروقی میں قیصر کا مقبوضہ ملک شام بھی خالد بن ولید نے حاصل کر لیا تھا اور پھر قیصر روم بھی باجگزاروں کی صف میں آ گیا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں قیصر روم (نائی سی فورس) نے ۱۸۷ھ میں باجگزاری سے انحراف کیا تھا اس پر خلیفہ نے فریجیا کے مقام پر اس کو ایسی شکست دی کہ وہ سلطنت ہی صفحہ ہستی سے حرف غلط کی مانند مٹ گئی۔

مرشد جام سے مراد ہے ایران کے مشہور صوفی بزرگ شیخ الاسلام احمد جامِ زندہ پیل" ان کا پورا نام ابو النصر احمد بن ابو حسن اور لقب "زندہ پیل" تھا۔ آپ نے ۲۲ سال کی عمر ہی تبلیغ و دعوت کا کام انجام دینا شروع کیا تھا اور ساٹھ ہزار انسانوں کو راہ ہدایت دکھائی تھی ۔ آپ علوم ظاہری سے واقف نہ ہوتے ہوئے بھی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کا دیوان لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے جس کا اصل مسودہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ حضرت احمد جام کی تدفین مشہد اور ہرات کے درمیان کسی مقام پر ہوئی تھی۔ وہ جگہ اب "تربت جام" کے نام سے مشہور ہے۔ ہمایوں بادشاہ نے ۱۵۴۴ء میں آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جو اب تک موجود ہے۔

کاغذی پیرہن

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاغذی پیراہن کنایۃً صبح صادق کی روشنی اور مظلوم کی دادرسی کو کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم کی یہ رسم تھی کہ دادخواہ کاغذی لباس پہن کر بادشاہ یا حاکم وقت کے سامنے جاتا تھا کاغذی لباس کو دیکھتے ہی سمجھ لیا جاتا تھا کہ کوئی فریادی آیا ہے۔ کنایۃً عجز و بے چارگی کے لئے بھی مستعمل ہے۔ غالبؔ نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے خود لکھا ہے، ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے یہ اسی قسم کا اشارہ ہے جیسے دن کو مشعل جلانا یا خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی

شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے کا اس کا پیراہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج وملال و آزار ہے" (عود ہندی ص ۱۶)

اکثر ایرانی شعرانے بھی اس تلمیح کو استعمال کیا ہے۔ بابا فغانی شیرازی فرماتے ہیں۔

زخوباں دادی خواہم۔ فغانی مہربانی کو　　کہ سازد کاغذی پیراہن از طومار افسوں ہم

کمال اسمٰعیل فرماتے ہیں۔

کاغذیں جامہ بپوشید وبدرگاہ آمد	زادۂ خاطر من تا بہ دہی داد مرا

کعبہ

مرزا غالبؔ کا شعر ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالبؔ	شرم تم کو مگر نہیں آتی

کعبہ کے لغوی معنی شش پہلو کے ہیں لیکن مرادی معنی بلندی اور سطح مرتفع کے ہیں بیت اللہ (خدا کے گھر) کو اسی لئے کعبہ کہا جاتا ہے اس کی سطح مرتفع ہے یا ازروئے مراتب رفیع اور عظیم الشان ہے۔ تمام عالم کے مسلمان کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہر سال ۱۰ ذالحجہ کو وہاں جمع ہو کر اس کا طواف کر کے حج کرتے ہیں۔

مشہور ہے کہ کعبہ کی اساس سب سے پہلے حضر آدمؑ نے رکھی تھی لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید کے مطابق کعبہ کی تعمیر کا کام حضرت ابراہیم اور ان کے عالی مرتبت صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ نے کیا تھا۔ توراتؔ کے روایت کے مطابق جب جناب سائرہ (حضرت ابراہیم کی پہلی بیوی) کا انتقال ہو گیا تو دونوں بزرگ باپ بیٹے نے مل کر ایک مربع گھر کی بنیاد ڈالی اور جب خانہ کعبہ کی دیواریں اُٹھ گئیں اور گھر بن کر تیار ہو گیا تو وحی الٰہی نے پیغام سنایا۔

> "ہمارا گھر طواف کرنے والوں (نماز میں قیام کرنے والوں) رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں پیدل بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے" (سورۂ حج)

مولانا شبلی نعمانیؒ نے علامہ ارزقی کی تاریخ مکہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کعبہ کی جو تعمیر کی تھی اس کی بلندی زمین سے چھت تک ۹ گز۔ طول حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز و عرض رکن شامی سے ۲۲ گز تھا۔ خدا کا یہ پہلا گھر تھا جو خدا پرستی کے معبد و مرکز کی حیثیت سے تمام جہان والوں کے لئے سر تا پا برکت ہے۔ اس کی ابتدائی تعمیر ایسی تھی کہ نہ تو اس کی چھت تھی۔ نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ۔ جب کعبہ کی تولیت قصی بن کلاب کے سپرد ہوئی تو انھوں نے قدیم عمارت کو گرا کر نئے سرے سے عمارت تعمیر کی تھی اور کھجور کے تختوں سے اس کی چھت پاٹی تھی۔ حرم کعبہ پر سب سے پہلے یمن کے بادشاہ اسد تبع نے پردہ چڑھایا جو یمن کی مشہور چادروں "بردیمانی" سے طیار ہوا تھا۔ قصیٰ بن کلاب کے زمانہ سے ہی اس پردے کی طیاری کے لئے سارے قبائل سے محصول لینے کا رواج شروع ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھوائے تھے اس کے بعد عہد بہ عہد اس پر طلاکاری کا کام ہوتا رہا۔

کعبہ میں عمر بن لحی کے زمانہ سے کچھ بت لا کر رکھے گئے تھے۔ آنحضرت صلعم کی بعثت تک یہ معبد اعظم اور مشرکین کے قبضہ میں رہا اور اس میں تین سو ساٹھ بت جاگزیں تھے ان تمام بتوں کو قریش خدا مانتے تھے۔ ۱۰ ر رمضان المبارک ۸ھ کو فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلعم نے کعبہ سے بتوں کو ہٹایا۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی	گرواں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں

گبر و ترسا

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

اسد قدرت سے حیدر کی ہوئی ہر گبر و ترسا کو
شرار سنگ بت ہی بر بنائے اعتقاد آتش

گبر (بہ فتح اول و سکون دوم) آتش پرست کو کہتے ہیں۔ ترسا (بہ فتح اول) پیروان مسیح کے لئے مستعمل ہے۔ فرہنگ جہانگیری نے ترسا کے معنی بھی آتش پرست کے لکھے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ فرہنگ آنند راج کے مطابق ترسا کے معنی ترسندہ۔ عابدان تو نصاریٰ

یعنی راہبوں کے لئے مستعمل ہے۔ حضرت سعدی فرماتے ہیں ۔

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب	گبرو ترسا وظیفہ حوزداری

فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں ترسا کے معنی مطلق کافر بلکہ بت پرست کے بھی لکھے ہیں اور اس کے لئے نظیری کی مثال دی ہے ۔

نہ تواں کم زپیر ترسابود	میرواز کف صنم بروں نہ دہد

غوامض سخن میں ترسابچہ کے معنی پسر نصرانی کے لکھے ہیں جو آتش پرست بھی ہوتے ہیں اور مسیحی بھی۔ اصطلاح سالکان میں ترسابچہ کے معنی مرشد کامل اور پیر طریقت کے لکھے ہیں اس کی وجہ تسمیہ اس طرح دی ہے "مرشد کامل یہ ترسابچہ باّں معنی دارد کہ درولادت معنی نسبت کامل ادبہ کافل دیگر کہ متصف بصفت ترسائی و تجردوانقطاع بودہ باشدمی سدو آں کامل راباز بکاملے دیگر بطناعن بہ بطن کہ طریق اولیاءاللہ است تاسلسلہ منتہی بہ حضرت رسالت پناہ می شود۔ علم وراثت خبر بائیں طریق میسر نمی شود"۔

گلستان ارم

گلستان ارم شداد کی بنائی ہوئی نقلی جنت ارضی کانام ہے اس کو بہشت شداد بہشت ارم۔ باغ ارم یا صرف ارم بھی کہا جاتا ہے۔

مرزا غالب فرماتے ہیں ۔

حیرت حدا قلیم تمنائے پری ہی
آئینے پہ آئین گلستان ارم باندھ

شداد عاد بن عوص کے بیٹے کانام تھا۔ یہ عرب عاربہ کے گروہ سے اور سام بن نوح کی نسل سے تھا۔ شداد کی عمر کے متعلق بھی روایتیں مختلف ہیں جن میں سے مشہور یہ ہے کہ اس نے نوسو برس کی عمر پائی تھی۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں صرف اتنا مذکور ہے۔

"اَلَمْ تَر کیفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ہ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمادِ الَّتی لَمْ یُخلَقْ مِثلُھا فِي البِلادِ (الفجر۔۶۹۔۶) یعنی تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم سے کیا معاملہ کیا جن کے قدو قامت ستونوں جیسے (دراز) تھے (اور) جن کے برابر (زور

دقوت میں) شہروں میں کوئی شخص پیدا نہیں کیا گیا"۔

مفسرین نے ارم ذات العماد سے "ارم ستونوں کے ساتھ" مراد لی ہے۔ یعنی ارم کو کوئی شہر تصور کیا ہے یاقوت نے بھی ارم کو شہر لکھا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ذات العماد شاید دمشق کا قدیم دوسرا نام یعنی عرفیت ہو جہاں قوم عاد کا مسکن تھا۔ بعض مفسرین نے ارم بن عوص کو شداد کا نام تصور کر کے ایک جنت اس کے نام سے منسوب کر دی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے "نہ صحرائے عدن میں کوئی ایسا شہر ہے اور نہ کوئی ایسی جنت بنائی گئی تھی۔" یہ ممکن ہے کہ ارم نے اپنے نام پر کوئی باغ بنایا ہو اور وہ کوئی خاص شہرت رکھتا ہو لیکن کسی ارضی بہشت کا کوئی تاریخی یا قرآنی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس بہشت کی جائے وقوع میں بھی اختلاف ہے کوئی اس کو صحرائے عدن میں بتاتا ہے اور کوئی اسکندریہ یا دمشق میں۔

اس بہشت کے متعلق عام اور مشہور روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر آٹھویں بہشت بنالیا ہے یا یہ بہشت دنیا پر تو موجود ہے لیکن انسانی نظروں سے اوجھل ہے۔ کہتے ہیں کہ عاد کے دو بیٹے شداد اور شدید نام کے تھے۔ شدید کے مرنے کے بعد جب اس کا چھوٹا بھائی بادشاہ ہوا تو اس نے جنت کے اوصاف سن کر نواحی شام کے نخلستانوں میں ارم نام کا ایک شہر بسایا تھا اس کام میں اس کی مدد ضحاک نے بھی کی تھی جو اس زمانہ میں تخت جمشید (ایران) پر قابض تھا۔ شداد نے اس شہر کو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کرا کے یاقوت، زبرجد اور دوسرے قیمتی پتھروں سے پچی کاری کی گئی۔ زمین پر خاک کی جگہ عنبر اور زعفران بچھایا گیا اور نہروں میں ریگ کے بدلے آبدار موتی ڈالے گئے۔ تازہ دودھ، شہد اور شراب کی نہریں جاری کی گئیں جن کے کنارے جواہرات کے درختوں پر جواہرات کے ہی پرند تھے۔ ان مصنوعی درختوں کے پھولوں میں مشک، عنبر، صندل اور زعفران رکھا گیا تھا۔ سارے ملک سے حسین جمیل لڑکیاں اور لڑکے حوروں غلماں بنانے کے لئے لائے گئے۔ مشہور ہے کہ یہ شہر تین سو برس کی طویل مدت میں طیار ہوا تھا مگر شداد اس کو خود نہ دیکھ سکا۔ حضرت ہودؑ کی متواتر تنبیہ کے بعد بھی جب شداد اس جنت کو دیکھنے گیا تو راستہ میں ایک زبردست آندھی سے ہلاک ہو گیا اور وہ شہر بھی ریگستان بن گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ شداد بہشت کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن وہ اس کے اندر

قدم نہ رکھ سکا اور دروازہ پر ہی اس کی روح قبض کرلی گئی۔

مشہور مورخ المسعودی کی روایت کے مطابق شداد کی بہشت کی ایک نقل اسکندریہ کے قریب بھی خود شداد نے ہی بنائی تھی۔ سکندرِ اعظم نے جب اسکندریہ کو فتح کیا تو وہاں بڑی بڑی عمارتوں کے کھنڈر تھے جن میں جواہرات کا استعمال ہوا تھا۔ امام طبری نے ارم کا یہ تعلق اسکندر سے ظاہر کیا ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ ذات العما کا یہ شہر اکثر لوگوں کو نظر آیا ہے۔ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ ایک بار امیر معاویہ بن سفیان کے عہد میں ایک شخص عبداللہ بن قلاوہؓ اپنے دو گمشدہ اونٹوں کو تلاش کرتے ہوئے ایسے شہر میں جا پہنچے تھے جہاں سے انھوں نے کافی جواہرات، مشک، عنبر اور کافور حاصل کرلیا تھا اس واقعہ پر مشہور صحابی کعب احبار انصاریؓ نے تصدیق کی تھی کہ وہ شہر ذات العماد تھا اس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے اس شہر کو بہت تلاش کرایا مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

لقا کی ڈاڑھی / عمر کی زنبیل

مرزا غالب کا شعر ہے۔

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی	غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

یہ دونوں تلمیحات داستان امیر حمزہ میں (حمزہ کا قصہ تلمیح بھی دیکھیں) لقا کی ڈاڑھی کنایتہً ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سجی، سنوری، مکلّف اور مزین ہو۔ زنبیل عمر سے مراد ایسی شئے ہے جو ہمیشہ خالی رہے۔ ہر چیز اس میں سما جائے اور وہ کبھی پوری نہ ہو۔

داستان امیر حمزہ کے مرکزی کردار کا نام لقا تھا جو ایک مشرک بادشاہ تھا اس نے خدا ہونے کا دعوا کیا تھا۔ داستان کے مطابق حضرت امیر حمزہؓ نے لقا کو راہ راست پر لانے کی ہر چند کوشش کی لیکن وہ اپنے دعوائے ربوبیت سے دست بردار نہ ہوا۔ اس سے سینکڑوں بار جنگ ہوئی ہر مقابلہ میں وہ ذلیل و خوار ہو کر توبہ کرتا اور پھر موقع پا کر فرار ہو جاتا۔ یہ سلسلہ مدت دراز تک چلتا رہا اور اس داستان کے دفتر بنتے گئے۔ داستان

کے مطابق لقا کا قد ستر آرنج (ہاتھ) کا تھا اس کی ڈاڑھی کئی گز لمبی اور چوڑی تھی۔ یہ ڈاڑھی ہر وقت مرصع بہ جواہر رہتی تھی۔ اس کے بال بال میں موتی پروئے رہتے تھے۔ اب عام طور پر لمبی چوڑی ڈاڑھی کو بھی کہتے ہیں جس کا بناؤ سنگار بہت ہوتا ہو۔

زنبیل (بروزن قندیل) کے معنی ٹوکری۔ جھولی اور کاسۂ گدائی کے ہیں۔ داستان امیر حمزہ میں اسلامی لشکر کے عیار کا نام عَمر یا عَمرو بتایا گیا ہے۔ اس عیار کو بزرگوں نے بہت سے عجائبات دئے تھے ان میں یہ زنبیل بھی تھی۔ اس زنبیل کی خوبی یہ تھی کہ اس میں دنیا کی ہر چیز سما سکتی تھی۔ اس زنبیل میں ہزاروں انسان، جادوگر، شیاطین اور قسم قسم کے جانور مقید تھے۔ اس کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ اس میں باقاعدہ کھیتی باڑی ہوتی تھی اور لوگوں کی آبادیاں تھیں۔ اس مملکت میں عمر کا سکہ چلتا تھا۔ ان تمام قیدیوں سے کھیتی باڑی کی مشقت لی جاتی تھی اور پہننے کو صرف ایک غرقی دی جاتی تھی۔

داستان امیر حمزہ میں ایک جلیل القدر صحابی۔ عم رسول اور جنگ احد کے شہید حضرت امیر حمزہؓ کی ایک خیالی داستان تصنیف کی گئی ہے۔ اس داستان کا عیار عمرو بن امیہ الضمیری کو ظاہر کیا گیا ہے جو خود بھی ایک صحابی اور تیز روی میں مشہور تھے۔ اس داستان کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے ساتھ ایسے واہیات قصے منسوب کیے گئے ہیں جو کبھی واقع ہی نہیں ہوتے تھے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی رزمیہ داستانیں ہوتی ہیں لیکن ان کے کردار بالکل فرضی ہوتے ہیں جیسے بوستان خیال یا پھر اصل واقعات کو بڑھا چڑھا کر داستان بنالی جاتی ہے جیسے فردوسی کا شاہ نامہ۔ نظامی کا سکندر نامہ اور آلھا اودل وغیرہ لیکن اس داستان میں کسی بنیاد کے بغیر ہی دو جلیل القدر صحابیوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

لقمان

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام	تمام دہر میں اس کے مطلب کا چرچا ہے

لقمانؔ زمانۂ قدیم کی ایک عجیب و غریب شخصیت کا نام ہے جس سے عرب کا قدیم لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ مجازاً عقیل، ادنا، تجربہ کار اور حکیم حاذق کو کہا جاتا ہے۔

عرب کے قومی افسانے اور قدیم روایتوں میں لقمانؔ کو ہیرو، دانشمند، کہن سال یعنی معمر اور حکیم بتایا گیا ہے۔ لقمان کی عمر سات نسر (گدھ) کے برابر طویل بتائی جاتی ہے اس طرح اگر ایک گدھ کی عمر اسی ۸۰ سال مان لی جائے تو اس کی عمر پانچسو ساٹھ ہوتی ہے بلکہ بعض روایتوں میں تو اس کی عمر ایک ہزار سے پانچ ہزار سال بتائی جاتی ہے۔ آبو حاتم سجستانی نے "کتاب المعمرین" میں طویل العمری کے سلسلہ میں لقمان کو خضر کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے۔ لقمان کی بہادری اور دانشمندی کے بے شمار واقعات عرب لٹریچر میں شامل ہیں۔ زانی کو سنگسار کرنے اور چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزاؤں کا موجد بھی لقمان کو بتایا جاتا ہے۔ تاریخ قدیم کے مطابق لقمان قبیلہ عاد[1] تانبہ سے خالص عرب نژاد عادل بادشاہ تھا۔

قرآن مجید میں لقمان کے حکمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر سورہ لقمان میں صراحت سے موجود ہے اس سورہ کی روشنی یہ نتیجہ اخز کیا جاسکتا ہے کہ حکیم لقمان عاد ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے ابن کثیر کی رائے میں لقمان افریقی النسل تھا اور عرب میں غلام کی حیثیت سے آیا تھا مولانا سلیمان ندوی نے ارض القران میں صحیفہ لقمان کو لقمان عاد سے ہی منسوب کیا ہے کچھ مفسرین نے اس کو نبی بھی قرار رہا ہے لیکن خیال قرآن مجید کے اسلوب بیان سے مطابقت نہیں رکھتا ہے جمہور یہ مفسرین اور علماء اس بات پر اتفاق ہے کہ لقمان خدا کا نیک بندہ حکیم اور عقلمند انسان تھا لیکن نبی نہیں تھا۔

مورخین اور افسانہ نگاروں کی روایتوں کے مطابق لقمان حضرت داودؑ کے زمانہ میں عہدہ قضا پر مامور تھا یا وہ حضرت ایوبؑ کا بھانجا تھا۔ تورات اور انجیل میں لقمان کو بلعم

---

[1]۔ عاد کا زمانہ دو ہزار سال قبل مسیح کا بتایا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اس قبیلہ کو "من بعد قوم نوح" کہہ کر نوحؑ کے خلفا میں اس کا شمار کیا ہے۔ یہ عرب کا ایک قدیم قبیلہ تھا یا امم سامیہ کے صاحب قوت واقتدار، افراد جماعت کا نام تھا اس قبیلہ کی اصنام پرستی اور اعمال شیطانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کے لئے حضرت ہودؑ کو مبعوث کیا تھا مگر ان کی مسلسل تبلیغ اور کوششوں سے بھی قوم عاد راہ راست پر نہ آئی تو اس پر آخری عذاب آندھی کی شکل میں نازل ہوا تھا۔ اس عذاب الٰہی سے پوری قوم نیست ونابود ہو گئی تھی۔

بن باعور ۔ اقرار دایا گیا ہے یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے حکمت اور پیغمبری میں اپنے لئے حکمت کا انتخاب کیا تھا اور علم و حکمت فہم و فراست اور فلسفہ میں اس کی کوئی نظر نہیں تھی۔

بعض علما کا یہ بھی خیال ہے کہ لقمان کی شخصیت الیسپ یونانی اور احیقار سے ملتی جلتی ہے کیونکہ دونوں بھی نصیحت آمیز حکاتیوں اور حکیمانہ مقولوں کے لئے مشہور ہیں الیسپ کا زمانہ تو ۶۲۰ ق م کا تھا جب کہ لقمان عہد داود ۱۰۵۰ ق م سمجھا جاتا ہے احیقار کے متعلق ضرور شبہ ہو سکتا ہے کہ لقمان ہو سکتا ہے کیونکہ دونوں کے مقولوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں نصائح لقمان کے سلسلہ میں یہ نصیحت مذکور ہے "جب چلو تو سیدھا راستہ چلو اور گفتگو کرو تو آہستہ سے کرو کیونکہ گدھے کی آواز بدترین آواز ہے بالکل یہی نصیحت سجاریب شاہ اشوریہ کے دانشمند وزیر احیقار کی بھی مشہور ہے "وہ کہتا ہے چلنے میں اعتدال اختیار کرو بولنے میں نرمی سے کام کو کیونکہ بلند آواز سے بولنے پر اگر کوئی گھر بن سکتا ہے تو گدھا ایک دن میں دو گھر بنالیتا"

لقمان کی حکایات کا پہلا مستند مجموعہ ۱۲۹۹ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا اس میں لقمان کے ۱۴۱ قصے گیے ہیں۔

لیلیٰ مجنوں

مرزا غالب فرماتے ہیں

غم مجنوں، عزاداروں لیلیٰ کا پرستشگر	خم رنگ سیہ پیانہ ہر چشم آہو تھا

لیلیٰ کے معنی شب رنگ اور سیاہ فام ہیں مجنوں کے معنی دیوانہ، سودائی اور اور ایسے شخص کے ہیں جس پر جنات کا سایہ ہو گیا، یہ دونوں نام رسوائے زمانہ عاشق و معشوق کے نام

ا بلعم بن باعور بنی اسرائیل کا ایک عالم تھا۔ حضرت مولانہ جلال الدین رومی نے لکھا ہے کہ وہ صاحب اسم اعظم تھا اس نے لوگوں کے بہکانہ پر حضرت موسیٰ کے لئے بددعا کی تھی اسم اعظم کی برکت سے اس کی دعا تو مستجاب ہوئی مگر حضرت موسیٰ نے اس کے لئے بددعا کی تو وہ اسم اعظم بھی بھول گیا اور کتے کی مانند اس کی زبان نکل آئی۔ امام رازی کے قول کے مطابق وہ پہلے راہ راست پر تھا مگر بعد کو گمراہ ہو گیا تھا۔)

ہیں اب تلمیحاً ہر عاشق کو اور معشوق کو لیلیٰ کہا جاتا ہے۔ غالبؔ ۔

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سربسر
کب تک خیال طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی

غالبؔ ۔

خیمہ لیلیٰ سیاہ وخانۂ مجنوں خراب
جوش ویرانی ہے عشق داغ بیروں دارہ سے

لیلیٰ مجنوں کی داستان محبت کو ابن خلدون اور ابن خلکان جیسے مستند مورخین نے محض افسانوی ادب قرار دیا ہے ابن الکلبی کا خیال ہے کہ لیلیٰ مجنوں کی کہانی اور مجنوں سے منسوب اشعار بنوامیہ کے کسی شاعر کی تصنیف ہیں اور بعد کے شعرا نے اس میں رنگ آمیزی کی ہے اس داستان کو دائمی شہرت دینے میں سب سے بڑا ہاتھ مولانا نظامی گنجوی (متوفی ۱۲۳۰ء) کا ہے ان کے مشہور خمسہ کی تیسری مثنوی لیلیٰ مجنوں ہے جو ۵۴۴ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ حضرت امیر خسرو، مولانا جامی اور مکتبی شیرازی کے نام بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کہ ان لوگوں نے لیلیٰ مجنوں کے قصے کو شہرت و دوام بخشی ہے ترکی زبان میں حمدی اور اردو میں نظیر اکبر آبادی نے اس قصہ پر طبع آزمائی کی ہے۔

مجنوں کا نام قیس بن ملوح تھا بعض بن معاذ بھی لکھا ہے اس کا باپ قبیلہ بنو عامر کا سردار تھا اسی لئے مجنوں کو قیس عامری کہتے ہیں غالبؔ ۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار	صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

غالبؔ ۔

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

لیلیٰ بھی بنو عامر کے ہی قبیلہ کے ایک شخص سعد کی بیٹی تھی اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بنی امیہ کے عہد میں ۹۷ھ تک حیات تھی۔ مجنوں کا انتقال ۸۰ھ میں ہوا تھا مگر اس بات میں شبہ ہے کہ یہ لیلیٰ والا مجنوں تھا یا کوئی دوسرا۔ ایک روایت یہ ہے کہ مجنوں حضرت امام حسینؑ کا دودھ شریک بھائی تھا مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ ایک وہ قیس بن ذریح تھا جو بنی کعب کی ایک لڑکی لبنیٰ پر عاشق تھا ان دونوں کی داستان محبت

کو ''قیس و لبنیٰ'' کے نام سے تلمیحاً استعمال کیا جاتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی کہانی مختصر الفاظ میں اس طرح ہے۔

قیس بن ملوح نے ایک بار عورتوں کی کسی محفل میں لیلیٰ بنت اسد کو دیکھ لیا تھا وہ پہلی ہی نظر میں اس کو دیکھ کر اس درجہ وارفتہ بیخود ہو گیا کہ اپنا عزیز ترین اونٹ ذبح کر کے ان لوگوں کی دعوت کردی۔ قیس کے عشق کا جواب لیلیٰ کی طرف سے حوصلہ افزا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے پر والہانہ طور پر جان چھڑکنے لگے نظر اکبر آبادی کے قول کے مطابق قیس بچپن سے ہی لیلیٰ کے عشق میں مبتلا تھا جب کہ وہ دونوں ایک ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے بہر حال بہت جلد اس عشق کا چرچا عرب کے قبائل میں پھیل گیا اور لیلیٰ کے خاندان کی فضیحت و رسوائی ہونے لگی دونوں کی ملاقات پر پابندی عائد کردی گی قیس اس قدغن کو برداشت نہ کر سکا اور وارفتگی میں عشق میں دیوانہ بن کر صحرا نوردی کرنے لگا۔ غالبؔ ؎

قیس بھاگا شرمندہ ہو کر سوئے دشت	بن گیا تقلید سے مری یہ سودائی عبث

غالبؔ ؎

عالم بے سروسامانی فرصت مت پوچھ	لنگر وحشت مجنوں ہے بیاباں میرا

شہر اور قبیلے کے لوگوں کو اس کی دیوانگی کا یقین ہو گیا اور اس کے ساتھ دیوانوں جیسا سلوک ہونے لگا۔ غالبؔ ؎

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ	سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مجنوں کی دیوانگی کے ساتھ لیلیٰ پر پابندی بھی دن بدن سخت ہوتی جا رہی تھی عالم قیس نے اسی عالم میں صحرائے نجد کی خاک چھاننا شروع کردی۔ غالبؔ ؎

ہر گردباد حلقہ فتراک، بیخودی	مجنون دشت عشق تحیر شکار تر

غالبؔ ؎

کس قدر خاک ہوا ہے دل مجنوں یارب نقش ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

لیلیٰ کا مسکن وادیٔ نجد کے قریب ہی تھا اور اکثر اس وادی سے لیلیٰ کا محمل گزرتا رہتا تھا ناقہ لیلیٰ کی گھنٹیاں مجنوں کے کانوں میں اس درجہ رچ بس گئی تھیں کہ وہ دور سے ہی آواز سن کر ناقے کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا تھا۔ کبھی وہ غبار ناقۂ لیلیٰ کا تعاقب کرتا اور کبھی ناقے کے پاؤں کی مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگاتا، چومتا اور اس کو دل سے لگائے کئی کئی دن گزار دیتا۔ غالبؔ ؎

زبس دوش رم آہو پہ ہے محمل تمنا کا
جنون قیس سے بھی شوخیِ لیلیٰ نمایاں ہے

غالبؔ ۔

بینائی یاددوست ہمرنگ تسلی ہے
موج تپش مجنوں محمل کش لیلیٰ ہے

لیلیٰ کی شادی اس کے باپ نے اپنے ہی قبیلہ کے ایک شخص ورد بن محمد العقیلی سے کردی۔ یہ شادی لیلیٰ کو بھی پسند نہ تھی کیونکہ وہ بھی مجنوں کے عشق میں بے تاب و بے قرار تھی۔ لیلیٰ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکی اور وہ اپنے محبوب کے فراق میں گھل گھل کر ختم ہو گئی مجنوں کو جب یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی تو وہ دیوانہ وار لیلیٰ کے قبر پر گیا اور اس پر گر کر مر گیا۔ نہ تو لیلیٰ رہی اور نہ مجنوں بس فقط ان کا قصہ ہی باقی رہ گیا ہے۔

مجلس آرائے نجف

مرزا غالبؔ کا شعر ہے۔

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں غالبؔ کی طرح
بے محل اے مجلس آرائے نجف جلتا ہوں میں

مجلس آرائے نجف سے مراد امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ہے کیونکہ آپ کا مزار مبارک نجف اشرف میں ہے۔ یہ شہر زیارت گاہ خلائق کوفے سے ۶ میل کے فاصلے پر عراق میں ہے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے قابل تعظیم، متبرک اور مقدس ہے۔ غالبؔ

خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا
چشم نقش قدم، آئینہ بخت بیدار

عام طور پر مشہور روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تدفین کوفے کے قریب ہوئی تھی اسی مقام کو نجف الکوفہ کہتے ہیں۔ بنی اُمیہ کے زمانہ میں مشہد علی ظاہر نہیں کیا گیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد مقامات پر مدفن مبارک ہونے کا شبہ ہوا۔ خود کوفے میں ہی ایسے متنازعہ مقامات کئی ہیں۔ استخری نے یہ مقام دو فرسخ کے فاصلہ پر لکھا ہے۔ ایک

روایت یہ بھی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تدفین مدینہ منوّرہ میں مرقد فاطمہؓ کے قریب ہوئی تھی۔ بہر حال عام اور مشہور روایت یہی ہے کہ مزار مبارک نجف اشرف میں ہے اس شہر کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ یہاں حضرت آدم اور نوح علیہم السلام کی قبریں بھی ہیں۔

محبِ چار یار۔ عاشق ہشت وچار

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
ایک محبّ چار یار، عاشق ہشت وچار ایک

یہ تلمیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار اقرب صحابہ (چار یار) اور سلسلہ امامت کے بارہ اماموں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

آنحضرت صلعم کے چار محبوب ترین صحابی حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر بن الخطابؓ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تھے جو اسی ترتیب سے یکے بعد دیگرے خلافت میں جانشین رسول ہوئے اور ان حضرات پر ہی خلافت راشدہ ختم ہوئی یہ چاروں حضرات عشرۂ مبشرہ میں بھی شامل تھے۔ ان چاروں حضرات کے مختصر حالات یہ ہیں:۔

(۱) حضرت ابو بکر صدیقؓ :

آپ حضرعت ابو قحافہ کے فرزند اور نوجوانوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں تھے۔ معراج کے واقعہ کی بھی سب سے پہلے تصدیق آپ نے ہی کی تھی۔ آپ آنحضرت صلعم کے یار غار، رفیق وہمدم اور مصیبت میں کام آنے والے تھے۔ آپ آنحضرت صلعمؐ کے بعد خلیفہ اول ہوئے۔

(۲) حضرت عمر بن خطابؓ :

آپ کا لقب فاروق تھا جس کے معنی ہیں حق و باطل میں امتیاز کرنے والا۔ آپ خلیفہ دوم اسلام کے جاں باز سپاہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر خصوصی تھے۔ آپ کے اسلام کے لئے آنحضرت صلعم نے دعا فرمائی تی کہ ”خدا وندا ۔ تو عمر بن خطاب یا عمر بن حشام (ابو جہل) میں سے کسی ایک سے اسلام کو مضبوط بنادے“ یہ دعا قبول ہوئی اور

حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کر لیا اور پھر اسلام کے لئے بڑی بڑی جاں نثاریاں کیں۔ آپ کے عہد خلافت میں سلطنت اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ آپ ۱۶/ ذالحجہ ۲۳ھ کو ۵۳ سال کی عمر میں شہید کر دیے گئے تھے مولانا شبلیؒ نے حضرت عمر کی جامعیت کمالات کے مطابق شاہ ولی اللہ کا قول نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

''سینۂ فاروق اعظم را بمنزلہ خانۂ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد۔ در ہر درے صاحب کمالے نشستہ در یک در مثلاً سکندر ذوالقرنین باآنہمہ سلیقہ ملک گیری وجہاں ستانی وجمع جیوش و برہم زدن اعداء در درِ دیگر نوشیروانے باآنہمہ رفق ولین و رعیت پروری وداد گستری (اگرچہ ذکر نوشیرواں اور در مبحث فضائل حضرت فاروق سوءادب است) ودر درِ دیگر امام ابوحنیفہ یا امام مالکی باآن ہمہ قیام بہ علم فتویٰ واحکام و در درِ دیگر مرشدے مثل سید عبدالقادر جیلانی یا خواجہ بہاؤالدین و در درِ دیگر محدثے بروزن ابوہریرہ وابن عمر و در درِ دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا فریدالدین عطار و مردمان گرداگرد ایں خانہ ایستادہ اند ہر محتاجے حاجت خود را از صاحب فن درخواست مینماید و کامیاب می گردد''۔

(۳) حضرت عثمان بن عفان :

آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب ذوالنورین تھا آپ کے عقد میں آنحضرت صلعم کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے آئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے بعد خلافت آپ کو ملی تھی اور بارہ سال تک آپ نے یہ فرائض انجام دیئے۔ آپ کے زمانہ میں بھی فتوحات بہت ہوئیں مگر اخیر میں آپ کے خاندان والے یعنی بنی اُمیہ آپ پر حاوی ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ زمانہ بدنظمی اور انتشار کا رہا۔ آپ ۸۲ سال کی عمر میں ۱۳/ یا ۱۸/ ذالحجہ ۳۵ھ کو شہادت پائی۔ مزار مبارک جنت البقیع میں ہے۔

(۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہ :

آپ خلافت راشدہ کے چوتھے سکون تھے۔ آپ کا مخصوص لقب مرتضیٰ (پسند کیا گیا) ہے کیونکہ آنحضرت صلعم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کے لئے آپ کو پسند کیا تھا۔ آپ آنحضرت صلعم کے حقیقی چچازاد بھائی، بچوں میں ایمان لانے والے پہلے، نفس رسول اور وحی مصطفیٰ تھے۔ سلسلہ امامت میں آپ حقیقی جانشین رسولؐ تھے آپ کا شمار آل عبا میں ہوتا ہے (آل عبا کی تلمیح دیکھیں) آپ کی فضیلت میں قرآنی آیتوں کے علاوہ بے شمار

حدیثیں بھی موجود ہیں۔ آنحضرت صلعم نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا کہ "میرے لئے علی ایسے ہیں جیسے موسیٰ کے لئے ہارون حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا"۔

ہشت و چار کا اشارہ اثنا عشر کی طرف ہے جس کے اصطلاحی معنی ہیں بارہ امام۔ آنحضرت صلعم کے بعد سلسلہ امامت میں جو حضرات جانشین رسول ہوئے وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حضرت امام مہدی آخرالزماں تک بارہ ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت ان اماموں کو مانتی ہے۔ ان اماموں کے اسمائے مبارک یہ ہیں:۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق، حضرت امام موسیٰ کاظم، حضرت امام علی رضا، حضرت امام محمد تقی، حضرت امام محمد نقی، حضرت امام عسکری اور حضرت امام مہدی آخرالزماں علیہم السلام۔

مَسَّنِی الضُّرّ و کِلہُ ایوّب

مرزا غالبؔ کا شعر ہے

آپ نے مسّنی الضرّ کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی

یہ قرآنی تلمیح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَایوّبَ اِذ نادیٰ رَبَّہٗ اِنیّ مَسَّنی الضُرُّ وَ انتَ ارحَمَ الراحِمین ہ" (الانبیاء۔۸۳) یعنی جب ایوب نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

حضرت ایوبؑ خدا کے برگزیدہ نبی اور حضرت لوطؑ کے نواسے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت، کھیت، مویشی اور اولاد کی دولت سے آسودہ حال کیا تھا۔ شیطان نے ان کو گمراہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک بار شیطان نے طنز کے طور پر کہا کہ اگر ایوب مفلس اور مجبور ہوتے تو اتنے صابر و شاکر ہرگز نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کا صبر اور ثابت قدمی دکھانے کے لئے ان سے سب کچھ لے لیا۔ کھیت جل گئے، مویشی مر گئے، ساری اولاد ختم ہو گئی دوست چھوٹ گئے اور سب کچھ تلف ہو گیا خود ان کے بدن میں آبلے پڑ گئے ان میں کیڑے پیدا ہو گئے ان تمام باتوں کے باوجود بھی گلہ یا شکوہ تو در کنار حضرت ایوب کی پیشانی پر کبھی بل تک نہ آیا ان کے ساتھ رفیق، مونس اور مددگار صرف

بیوی رہی جس نے تیرہ سال اسی طرح گذار دیئے، مشہور ہے کہ حضرت ایوب کے زخم سے اگر کوئی کیڑا زمین پر گر پڑتا تھا تو وہ اسے دوبارہ اٹھا کر زخم پر رکھ دیتے اور فرماتے کہ "تیری خوراک تو خدا نے اس زخم میں رکھی ہے تو کہاں جاتا ہے"۔

حضرت ایوب جب ہر قسم کے سخت سے سخت امتحان میں ثابت قدم رہے اور انھوں نے تمام آلام وشدائد خندہ پیشانی سے جھیل لیے تو دریائے رحمت جوش میں آیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ تندرستی، اولاد اور دوسری نعمتوں سے پہلے سے بھی زیادہ مالا مال کر دیا۔

مہِ نخشب

مرزا غالب کا شعر ہے ؂

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خرشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

مہِ نخشب اس مصنوعی چاند کو کہتے ہیں جس کو حکیم ابن عطا نے چھٹی صدی ہجری میں بنایا تھا اور اس کی روشنی چار چار فرسنگ اصلی چاندنی کی مانند جاتی تھی۔ یہ چاند کوہ سیام سے طلوع ہو کر پھر صبح کو اسی کنویں میں واپس چلا جاتا تھا۔ اس لئے اس کنویں کو چاہ نخشب اور چاند کو ماہ نخشب[1] اور ماہ سیام بھی کہا جاتا ہے۔

نظامی فرماتے ہیں ؂

چو ماہ آئینہ سیماب دادہ چو ماہ نخشب از سیماب زادہ

مشہور ہے کہ اس چاند کو چند اجزائے سیمابی سے ترتیب دے کر بنایا گیا تھا اس نے چار ماہ تک متواتر کام کیا تھا پھر کسی وجہ سے اس کا نظام بگڑ گیا اور اس نے روشنی دینا بند کر دی۔ حکیم ابن عطا جو ابن مقنع کے نام سے مشہور ہے خوارزم کا ایک مشہور کیمیادان اور علم طبیعات کا ماہر تھا۔ تاریخ ابن خلدون کے مطابق یہ حکیم بہت پستہ قد، آنکھ سے کانا اور بد صورت تھا اس لئے اپنے چہرہ پر ہر وقت سبز ریشمی نقاب ڈالے رکھتا تھا اسی وجہ سے ابن مقنع یا حکیم برقعی کے ناموں سے مشہور ہوا وہ حکیم مردوں کو زندہ کرنے اور غیب کا علم جاننے کا

---

[1] حاشیہ نخشب ترکستان کے ایک شہر کا جدید نام ہے۔ پہلے اس کو لسف کہتے تھے۔ یہ شہر کشکا دریا کے قریب بخارا اور بلخ کے درمیان چار دن کی مسافت پر ہے ترکی میں اس شہر کا نام "قرشی" ہے۔

بھی دعویدار تھا۔ وہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور اس کے نزدیک دین کا اعمال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس حکیم نے پیغمبری کا دعوا کر کے اس چاند کو اپنا معجزہ قرار دیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے وہ ایک صوفی درویش اور احمد یاسوی کا مرید تھا۔ بہر حال اس حکیم کے بارے میں محض روایتیں ہی موجود ہیں کوئی تاریخی ثبوت اس کے بنائے ہوئے چاند کے لئے بھی موجود نہیں ہے۔ حکیم ابن عطا کا انتقال ۵۶۲ھ میں سمرقند میں ہوا تھا۔

مہر سلیماں / سلیماں کا نگیں

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم	وگرنہ مہر سلیماں و جام جم کیا ہے

مہر سلیماں سے مراد حضرت سلیمان بن داؤدؑ کی انگوٹھی سے ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ اس کو انگشتر سلیماں کا نگیں'' بھی کہتے ہیں۔ غالبؔ ؎

یاد افسانہ بیمار ہے عیسیٰؑ کا نفس استخواں ریزۂ موراں ہے سلیماں کا نگیں

حضرت سلیمانؑ کے وزیر کا نام آصف بن برجنا تھا قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ اس کے پاس اسم اعظم تھا۔ غالبؔ ؎

آصف کو سلیماں کی وزارت کا شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تری وزارت

مشہور ہے کہ اس انگوٹھی کے تابع جن، شیطان، دیو، چرند اور پرند سب تھے۔ یہ ممکن ہے کہ انگوٹھی پر اسم اعظم کندہ ہو اور حضرت سلیمان اس کی برکتوں سے بہرہ ور ہوتے ہوں مگر ان کی عظیم الشان سلطنت کا سبب یہ انگوٹھی ہرگز نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی تھی اور اللہ نے ہی ان کے حق میں سب کو مسخر کیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی کے متعلق بے شمار اسرائیلی روایتیں مشہور ہیں مثلاً ان کی بیوی امینہ بت پرست تھی اور خفیہ طور پر اپنے باپ کے بت کی پرستش کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک امینہ حضرت سلیمانؑ کے گھر میں رہی وہ تاج و تخت سے محروم رہے۔ مشہور ہے کہ ان کی انگوٹھی شیطان نے چرالی تھی اور وہ سلیمان کی صورت میں بادشاہت کرنے لگا۔ جب عتاب الٰہی کی مدت ختم

ہوئی تو یہ انگوٹھی ان کو واپس مل گئی تھی اور انھوں نے شیطان سے اپنا ملک واپس لے لیا تھا
ایسی روایتوں سے محتاط مفسرین نے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ہے۔ سعدی فرماتے ہیں ۔

فریدوں را سر آمد بادشاہی سلیماں را برفت ازدست خاتم

ناقۂ سلمیٰ

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔

کیوں اسے تکمۂ پیراہن لیلیٰ کہیے
کیوں اسے نقش پے ناقۂ سلمیٰ کہتے

سلمیٰ عرب کی ایک حسین عورت کا نام تھا جس کی داستان محبت بھی لیلیٰ مجنوں کی مانند مشہور ہوئی ہے۔ مرکزی عرب یعنی وادی نجد کی دو پہاڑیوں کے نام سلمیٰ اور اجّع ہیں یہ دونوں پہاڑیاں یکساں اور متوازی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے نام پر دو قبیلوں کے نام رکھے گئے تھے ان پہاڑیوں سے متعلق زمانہ جاہلیت سے ہی بہت سے افسانے منسوب ہیں اور بے شمار قومی روایتیں مشہور ہیں۔ مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں سلمیٰ اور اجّع نام کے دو عاشق و معشوق تھے ان دونوں کی ملاقاتیں الاوجّع کے یہاں ہوا کرتی تھیں جو سلمیٰ کی دایہ تھی۔ یہ دونوں مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جب سلمیٰ اور اجع کو ان دونوں کے قبیلوں نے پکڑنے کی کوشش کی تو دونوں پہاڑیوں پر چڑھ گئے ان دونوں کے درمیان وادی الاوجع تھی وہاں قبیلہ والوں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ یاقوت نے المعجم میں ابن کلبی کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد سیاہ اور سنگلاخ پہاڑ کے کنارے پر ایک انسانی شبیہ سرخ رنگ کی اُبھر آئی تھی جس کی پرستش قبیلہ کے لوگ کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے حکم سے اس بُت کو مسمار کر دیا گیا۔ مدت تک یہ پہاڑ اور وادی ان تینوں ناموں (عاشق، معشوق اور دایہ) سے منسوب رہے مگر اب ان کو شمار کہا جاتا ہے۔

نخل طور، شرر طور

مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

بزم خوباں، بسکہ جوشِ جلوہ سے پرنور ہے
پشت دستِ عجز یاں ہر برگِ نخلِ طور ہے

نخل طور سے مراد ہے کوہ طور کی وادی کا مشہور درخت جس پر حضرت موسیٰ کو پہلی بار نورِ الٰہی کا شعلہ نظر آیا تھا۔ اس درخت کو "نخلِ ایمن" بھی کہتے ہیں چنانچہ صائب فرماتے ہیں ؎

جائے حیرت نیست گر کاغذ یدِ بیضا شود
کلکِ صائب زین غزل گردید نخلِ ایمنی

ایک بار حضرت موسیٰ نبوت سے قبل مع اپنے اہل و عیال کے مصر واپس آرہے تھے جب وادیٔ ایمن سے گزرے تو وہاں شدید خنکی تھی اس لئے آگ کی ضرورت محسوس ہوئی حضرت موسیٰ نے آگ کی تلاش میں دور دور نظر دوڑائی تو ان کو بہت دور ایک شعلہ سا چمکتا نظر آیا۔ وہ شعلہ یا شرر بھی عجیب تھا نہ تو اس میں کوئی ارتعاش تھا اور نہ اس سے درخت کو کوئی نقصان پہنچ رہا تھا جس پر وہ چمک رہا تھا۔ شعلہ کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت موسیٰ خوفزدہ ہو گئے اور واپس آنے لگے تو وہ شعلہ جو اُن کے آگے بڑھنے سے پیچھے ہٹ رہا تھا اب ان کے قریب آگیا اور آواز آئی "یٰمُوسٰیؕ ہ اِنِّیٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًیؕ ہ وَاَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی" (طٰہٰ۔ ۱۲) یعنی اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں۔ پس تو اپنی جوتیاں اتار دے تو اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ! میں نے تجھ کو اپنی رسالت کے لئے چن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو سُن "اس کے بعد دیر تک حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی سے ممتاز فرمایا۔ معجزے عطا کیے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مقرر کیا۔ (تفصیل کے لئے تلمیح جلوہ طور بھی دیکھیں)

نورِ الٰہی کے اس شعلہ کے لئے "شررِ طور" کی تلمیح بھی مستعمل ہے غالبؔ ؎

صد تجلی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت	پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طور ہنوز

نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

مرزا غالب کا شعر ہے ۔

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب

نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

اس شعر میں نظام الدین سے مراد ہیں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین والیاء محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز (۶۴۵۔۷۲۵ھ) ہیں جو حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہ العزیز کے مرید، خلیفہ اور جانشین تھے۔ آپ کی وجہ سے ہی ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ پھیلا ہے۔ آپ کے متعدد خلیفہ تھے جنہوں نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں تبلیغ وہدایت کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ طوطی ہند ابوالحسن امیر بن امیر سیف الدین محمود شمسی المتخلص بہ خسروؒ بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کو بھی امیر خسرو سے ایک خاص انسیت تھی ایک بار آپ نے فرمایا تھا" میں سب سے تنگ آجاتا ہوں۔ اپنے آپ سے بھی تنگ آجاتا ہوں مگر ترک اللہ (امیر خسرو) میں تم سے تنگ نہیں آتا" آپ امیر خسروؒ کو پیار سے ترک اللہ کہا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا "میری زندگی پر تمہاری زندگی منحصر ہے لہذا تم (خسرو) یہ دعا کرو کہ تم میرے پہلو میں دفن ہو"۔ یہ دعا قبول ہوئی اور جب امیر خسروؒ کا وصال ۷۲۵ھ میں ہوا تو وہ اپنے مرشد کے قریب ہی دفن ہوئے۔ حضرت امیر خسروؒ کو اپنے مرشد سے جو والہانہ عشق تھا اس کے بے شمار واقعات مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر جب حضرت محبوب الٰہی کے خواہر زادہ تقی الدین نوح کے بے وقت انتقال ہو گیا تو حضرت کو اتنا صدمہ تھا کہ آپ نے کئی ماہ متواتر سماع بھی ترک رکھا جو آپ کی غذائے روحانی تھی اور آپ ہر وقت خاموش رہنے لگے۔ اسی دوران آپ اپنے مریدین اور معتقدین کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے ان دنوں بسنت کا تہوار تھا ہندوؤں کی ٹولیاں گاتی بجاتی مندروں کو جا رہی تھیں ہر طرف گیندے اور سرسوں کی بہار تھی لوگ زرد لباس پہنے مسرور اور شاداں نظر آ رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ کو یہ دیکھ کر اپنے مرشد کو خوش کرنے کا خیال آیا۔ آپ نے اسی وقت اپنی دستار کے پیچ کھولے اور اس میں سرسوں کے پھول الجھا کر یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے مرشد کی طرف چلے "اشک ریزہ آمدہ است بہار" آپ کی رسیلی آواز سے سارا ماحول متاثر ہو گیا

کیونکہ آپ موسیقی کے بھی نائک تھے۔ حضرت محبوب الٰہی کے کان میں جب ترک کی آواز پہنچی تو وہ بھی بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے اور جب آمنا سامنا ہوا تو خسرو نے دوسرا مصرعہ پڑھا "ساقیا گل بریز بادہ بہار" اس کو سنتے ہی مرشد پر بھی ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور آپ نے بیتاب ہو کر اپنا دامن و گریبان چاک کر دیا۔ اس کے بعد سے حضرت محبوب الٰہی کا وہ تکدر دور ہو گیا۔ اب ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو حضرت محبوب الٰہی سے نسبت رکھتا ہو اور حضرت امیر خسرو سے واقف نہ ہو۔

حرف سرائے اعجاز فن و رنگ آمیز بہارستان سخن سر آمد ارباب دانش وری علامہ دہر حضرت امیر خسرو دہلویؒ لاچین قبیلہ کے ترک تھے۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود شمسیؒ ترک وطن کر کے ہزارہ سے تشریف لائے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ ۶۵۱ھ میں موضع پٹیالی (ہندوستان) میں تولد ہوئے تھے آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے نانا عماد الملک نے کی تھی جو سلطنت دہلی کے ممتاز سردار تھے حضرت امیر خسروؒ نے بھاکا کو فارسی اور عربی کی چاشنی دے کر ریختہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ فن موسیقی میں وہ مہارت پیدا کی نائک کہلائے۔ ستار کے بھی آپ موجد تھے۔ امیر خسرو نے غیاث الدین بلبن (۶۶۴۔۶۸۶ھ) سے سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵۔۷۵۲ھ) تک سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ آپ نے تصنیف و تالیف کا بھی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ آپ کے چار دیوان تحفۃ الصغر۔ وسط الحیات۔ غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ کا انتخاب "کلیات خسرو" کے نام سے نولکشور پریس لکھنو سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی بے شمار تصانیف میں "نہایت الکمال" (غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ) مفتاح الفتوح (جلال الدین فیروز شاہ کی مہم کا قصہ) مطلع انوار (اخلاقی نظمیں) شیریں و خسرو اور لیلیٰ و مجنوں (نظامی گنجوی کی مثنویوں کا عکس) ہشت بہشت (نظامی کی ہفت پیکر کا عکس) قران السعدین (ناصر الدین بغرا خاں کا قصہ) نوح سپہر (قطب الدین مبارک شاہ کا قصہ) اور اعجاز خسروی (متفرق کلام) خاص طور پر مشہور ہیں۔

مرزا غالب نے خود کو سراج الدین محمد بہادر شاہ (۱۷۷۵۔۱۸۶۲ء) سے وہی نسبت ظاہر کی ہے جو امیر خسروؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے تھی۔ مرزا غالب اسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس شعر کے متعلق خواجہ الطاف حسین حالی نے یادگار غالب، میں لکھا ہے کہ "مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے اس قسم کے اشعار دربار میں

پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ اور امیر خسروؒ کی خصوصیات کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا" حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب اور ابوالمظفر بہادر شاہ ظفؔر سلسلہ چشتیہ میں حضرت مولانا فخر الدین محمد دہلویؒ کے خاندان سے بیعت تھے اس لیے یہ دونوں پیر بھائی تھے۔

نل و دمن

مرزا غالب کا شعر ہے ۔

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگر چہ زانوے نل پر رکھے دمن تکیہ

نل و دمن کا افسانہ محبت مہابھارت کا ایک ضمنی قصہ ہے۔ علامہ فیضی نے اس قصہ کو مثنوی کی صورت میں نظم کیا ہے۔ یہی مثنوی نل و دمن کی شہرت کا اصل سبب ہے اب یہ قصہ بھی "شیریں و فرہاد" اور "لیلیٰ مجنوں" کی مانند شہرت دوام حاصل کر چکا ہے۔

نل نشادھ دیس کا راجہ تھا وہ خوبصورت۔ باہمت اور ویدوں کا عالم تھا۔ دمن یعنی دمینتی ودھرب دیس کے راجہ بھیم کی حسین و جمیل اور اکلوتی بیٹی تھی۔ نلؔ و دمنؔ ایک دوسرے کے حسن و جمال کی تعریف سن کر نادیدہ عاشق ہو گئے تھے۔ راجہ بھیم نے جب دمینتی کا سوئمبر کیا تو نل کے علاوہ چار دیوتاؤں نے بھی نل کی صورت بنا کر شرکت کی تھی لیکن دمینتی نے اصل نل کو پہچان کر ہی انتخاب کیا اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ نل کا چھوٹا بھائی پُشکر بہت بد طینت اور حاسد تھا۔ اس نے ایک بار جوا کھیلا اور دمینتی کو جیت لیا۔ پُشکر نے سلطنت پر تو قبضہ کر لیا لیکن نل۔ اس کی بیوی اور دونوں بچوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ان لوگوں کی کوئی بھی مدد نہ کرے۔ ایک عرصہ تک یہ خاندان جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا ایک دن دمینتی کے سوتے میں نل اس کو چھوڑ کر چلا گیا تاکہ وہ مزید مصائب نہ جھیلے اور اپنے گھر چلی جائے۔ دمینتی راجہ چھیدی کی مدد سے اپنے مائکے چلی گئی۔ اسی زمانہ میں نل کو سانپ نے کاٹ لیا جس کے زہر سے نل کی موت تو نہ ہوئی۔ مگر اس کا بدن نیلا ہو کر وہ بہت کریہہ المنظر اور کوتاہ قد ہو گیا۔ اسی حالت میں نل نے ماہک کے فرضی نام سے راجہ پرتوکرن کے یہاں ملازمت کر لی۔ دوسری طرف دمینتی نے نل کو بہت تلاش کرایا اور اسی مقصد کے لئے اپنا

سوئمبر دوبارہ کرایا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ نل کہیں بھی ہو سوئمبر میں ضرور آئے گا۔ سوئمبر کے دن راجہ پر نوکرن کے نوکر کی حیثیت سے نل گاڑی بان بن کر گیا دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا پھر دیوتاؤں کی مدد سے نل کا رنگ روپ بھی پہلے جیسا ہو گیا اور اسے کھوئی سلطنت بھی واپس مل گئی۔

نمرود کی خدائی

مرزا غالب کا شعر ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

(نمرود کی اصل لم یمت ہے یعنی وہ شخص جو کبھی نہ مرے۔ اس کے مفرس "نہ مرد" سے نمرود بن گیا ہے۔ اسرائیلی روایتوں میں اس کو بالکسر نون اور بالفتح رے یعنی نمرود بھی لکھا گیا ہے)

نمرود عراق کے بادشاہوں کا قدیم لقب ہے۔ جس طرح مصر کے بادشاہ کو فرعون، چین کے بادشاہ کو فغفور اور روم کے بادشاہ کو قیصر کہا جاتا ہے۔ عراق کے یہ بادشاہ (نمرود) خود کو معبود قرار دے کر اپنے بتوں کی رعایا سے پرستش کراتے تھے اس لئے "نمرود کی خدائی" سے مراد باطل اور ناقص خدائی سے ہے عام طور پر اُردو و فارسی ادب میں جس نمرود کا ذکر آتا ہے اس کا نام صاحب روضۃ الصفا نے کیکاؤس لکھا ہے یہ نمرود حضرت ابراہیمؑ کا ہمعصر تھا۔ حضرت ابراہیم سے سرکشی کرنے کی سزا میں وہ مچھر کے وار سے ختم ہوا تھا۔

طبری نے اس نمرود یعنی کیکاؤس کا شمار سلیمان بن داؤد اور سکندر ذوالقرنین جیسے الوالعزم بادشاہوں میں کیا ہے جن کی حکومت تمام عالم پر قائم تھی۔ قرآن مجید میں نمرود کا نام تو موجود نہیں ہے لیکن حضرت ابراہیم کے ساتھ اس کے مناظرہ کی تفصیل موجود ہے۔

اسرائیلی روایتوں کے مطابق نمرود نے اپنے باپ کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا اس نے اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اس بادشاہ کے لئے تارخ (حضرت ابراہیم کے مشرک باپ) نے ایسا محل تیار کیا تھا کہ اس میں دودھ۔ شہد اور تیل کی نہریں بہتی تھیں۔

نمرود کو نجومیوں نے بتایا تھا کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو خدائے واحد کی پرستش کرے گا اور سلطنت نمرود کو نیست و نابود کر دے گا اس پیشگوئی پر نمرود نے ہزاروں نوزائیدہ بچوں کو قتل کرادیا تھا مگر حضرت ابراہیم محفوظ رہے کیونکہ ان کی پیدائش پر ان کی ماں اوشا نے بچہ کو چھپالیا تھا۔

مفسرین کے مطابق نمرود شروع میں سخی اور عادل بادشاہ تھا لیکن جب شیطان نے اس کو ورغلایا تو گمراہ ہو گیا اور خدا ہونے کا دعوا کرنے لگا اس نے اپنی صورت کے مجسمے ملک کے تمام ہیکلوں میں پرستش کے لیے بھجوادئے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اس کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی ایک طویل مناظرہ ہوا جس میں نمرود ناکام رہا لیکن پھر بھی گمراہ ہی رہا۔ آخر مجبور ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ساری قوم ایک مذہبی میلے میں شرکت کے لئے گئی ہوئی تھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ہیکلوں میں جا کر نمرود اور دوسرے دیوتاؤں کے تمام بت توڑ ڈالے۔ قوم جب میلے سے واپس آئی تو اپنے معبودوں کی یہ درگت دیکھ کر مشتعل ہو گئی۔ حضرت ابراہیم سے جب باز پرس ہوئی تو آپ نے جواب دیا" یہ حرکت میری نہیں ہے بلکہ سب سے بڑے بُت کی ہے جس نے رشک وحسد کی وجہ سے اپنے ہمعصروں کو توڑا ہے" سب سے بڑا پجاری آذر یعنی ان کا مشرک باپ اور دوسرے کاہن شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے کیونکہ وہ سب لوگوں کے سامنے یہ کیسے کہتے کہ پتھر کے بُت حرکت نہیں کر سکتے ہیں۔ مجمع کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ ان کے بتوں میں چلنے پھرنے بولنے اور جنبش کرنے کی طاقت نہیں ہے اس موقع پر بہت سے لوگ رب ابراہیم پر ایمان لے آئے اس فیصلہ کے بعد نمرود کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی اور اس نے عاجز آکر یہ فیصلہ کیا کہ ابراہیم کو آگ میں ڈال کر ختم کر دیا جائے۔ اس زمانہ میں مجرموں کو آگ میں یا جنگلی جانوروں کے سامنے ڈالنے کا عام رواج تھا۔ ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا گیا۔ شاید یہ دنیا کی سب سے شدید آگ تھی کیونکہ ایک فرلانگ مربع میں لاکھوں من لکڑیاں ڈال کر یہ الاؤ لگایا گیا تھا جس پر سے پرند تک نہیں اڑ سکتے تھے۔ اور چار چار فرلانگ تک کوئی بھی ذی روح کا وہاں رہنا مشکل تھا۔ جب الاؤ خوب دہک گیا۔ خدا کے حکم پر اس آگ نے ابراہیم کا بال بھی بیکانہ کیا اور وہ سرد ہو کر گلزار بن گئی۔ اس میں طرح طرح کے پھول کھل گئے اور آب شیریں کے چشمے جاری ہو گئے۔ اس آگ کو تلمیحاً گلزار خلیل، گلستان ابراہیم اور آتش نمرود کہتے ہیں۔ مرزا صائب فرماتے ہیں ؎

نیست دلگیری زدنیا بندۂ تسلیم را
آتش نمرود گلزار ست ابرہیم را

سعدی شیرازی فرماتے ہیں ۔

بہ باغ تازہ کن آئین دین زر تشتی
کنوں کہ لالہ برافروخت آتش نمرود

مشہور ہے کہ نمرود نے چار سو سال تک متواتر بندگان خدا کو گمراہ کیا تھا حضرت ابراہیمؑ نے اس کو طرح طرح کے معجزے دکھائے۔ عذاب الٰہی سے ڈرایا اور آخر کار لشکر آسمانی کی دھمکی دی مگر نمرود اپنے دعوائے ربوبیت سے دست بردار نہ ہوا بلکہ اس نے ابراہیمؑ کے خدا سے بھی مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسرائیلی روایت کے مطابق تو اس نے کسی پرند پر بیٹھکر آسمان کی طرف پرواز بھی کی تھی اور ایک تیر اوپر کی طرف چھوڑا تھا تھوڑی دیر میں وہ تیر اور نمرود دونوں زمین پر آگرے لیکن شیطان نے اس تیر کو خون آلود کر دیا تھا۔ اس بات نے نمرود کو اور بھی مغرور کر دیا اور وہ یہ ظاہر کرنے لگا کہ ابراہیم کا خدا اس کے تیر سے (نعوذ باللہ) زخمی ہو گیا ہے۔

قرآن مجید اور مفسرین کی روایتوں کے مطابق نمرود نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا ”اگر کوئی آسمانی فوج ہے تو لاؤ اور میری طاقت کا کرشمہ دیکھو“ حضرت ابراہیم نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی جو قبول ہوئی اور جبریل نے آکر کہا۔ نمرود سے کہہ دو کہ ہماری فوج آتی ہے وہ اپنی فوج طیار کر لے“ نمرود نے تین دن میں تین لاکھ فوج تیار کر لی اور جب وہ ساری فوج ایک میدان میں جمع ہو گئی تو نمرود نے للکارا ”ابراہیم! کہاں ہے تمہاری فوج۔ لاؤ اس کو“ اسی وقت آسمان سے مچھروں کی ایک فوج نمودار ہوئی اور سیلاب کی مانند نمرودی فوج پر چھا گئی۔ مچھروں کی کثرت سے آفتاب کی روشنی چھپ گئی اور دن میں رات ہو گئی۔ ایک ایک نمرودی سپاہی کو لاکھوں مچھر لپٹ گئے اور دم کے دم میں خون کی ایک ایک بوند پی گئے۔ ساری فوج ہلاک ہو گئی۔ نمرود بھاگ کر اپنے محل میں جا چھپا مگر ایک لنگڑا کمزور سا مچھر وہاں بھی اس کے تعاقب میں پہنچا اور اس کی ناک کے راستہ دماغ میں گھس کر بھیجے پر وار کرنے لگا۔ اس طرح نمرود چالیس سال یا چالیس روز تک غضب الٰہی کی شدید اذیت میں مبتلا رہ کر ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک ہوا۔ ۔

واہ رے واہ ملک الموت تری باریکی
گھس گیا ناک میں نمرود کے مچھر بن کر (نامعلوم)

نوروز

مرزا غالب کا شعر ہے ۔

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگی صنعتِ حق اہلِ بصارت

نوروز کے معنی نیا دن یعنی نئے سال کا پہلا دن ہے۔ یہ ایران کا مشہور قومی تہوار ہے جو موسم بہار میں منایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا فروردیں کی پہلی تاریخ کو ہوتی ہے کیونکہ اس دن آفتاب برج حمل کے نقطۂ اول میں آتا ہے۔ اس تہوار کے دن دکانیں سجائی جاتی ہیں، چراغاں کیا جاتا ہے، ایک دوسرے پر لوگ رنگ ڈالتے ہیں اور ناچ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔

عربی اور فارسی کے مصنّفین اور شعرا نے جشن نوروز کی توصیف کی ہے۔ عمر خیام کا "نوروز نامہ" بھی مشہور ہے۔ فردوسی اور منوچہری نے بھی نوروز کے حالات لکھے ہیں۔

زرتشتی عقیدہ کے مطابق نوروز کے دن ہی اہورمزد (اللہ تعالیٰ) نے دنیا کی تخلیق کی تھی۔ اس دن سارے سیارے اوج تدویر میں تھے اور سب کا اجتماع برج حمل کے نقطۂ اول میں تھا۔ اہورمزد کے حکم پر وہ سارے سیارے ایک دم گردش کرنے لگے اور اسی دن دنیا میں حضرت آدمؑ کا نزول ہوا۔

فردوسی کے بیان کے مطابق ایک بار ایران کے پیشدادی سلسلہ کا بادشاہ جم دنیا کی سیر وسیاحت کو نکلا تھا۔ جب وہ آذربائی جان کے قریب تھا تو وہ دن آفتاب کے برج حملِ میں آنے کا تھا۔ جم ایک اونچے تخت پر مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب آفتاب کی پہلی کرن سے اس کے تاج و تخت کے سارے جواہرات جگمگانے لگے تو سب یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس دن کا نام نوروز رکھا گیا۔ اس دن جم کے نام میں "شید" یعنی شعاع کا بھی اضافہ ہوا اور وہ جمشید کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی لیے اس تہوار کو "جشنِ جمشید" بھی کہتے ہیں۔

ایران کے ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں یہ تہوار بہت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس دن بادشاہ کی طرف سے عام دعوت ہوتی تھی۔ اراکین سلطنت بادشاہ کو نذریں گزار کر خطابات اور مناصب حاصل کرتے تھے۔ صوبوں کے گورنر مقرر کیے جاتے۔ آتش

کدوں کی صفائی ہوتی اور نئے سکے مضروب ہوتے تھے۔

غالب ؎

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز	ایک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

وصف دُلدُل ر شہ دُلدُل سوار

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

وصف دُل دُل سے مرے مطلعِ ثانی کی بہار	جنت نقش قدم سے ہوں میں اس کے گلچیں

دُل دُل آنحضرت صلعم کی مرغوب ترین سواری کو کہتے ہیں۔ یہ ایک سفید خچری تھی جس کو حاکمِ اسکندریہ نے آنحضرت صلعم کو تحفتاً پیش کیا تھا ۔ آپ نے اکثر غزوات میں اس پر ہی سواری فرمائی تھی۔

ان سائکلو پیڈیا آف اسلام میں دُل دُل کے معنی خار پشت یعنی سیہی کے لکھے ہیں جو بظاہر ایک خچری سے مناسبت نہیں رکھتے ہیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ اس خچری کی رفتار نرم اور نازک خرامی کے سبب یہ نام رکھا گیا ہو۔ منتخب اللغات اور صراح میں اس کے اصطلاحی معنی ہی دیے گئے ہیں۔ غالب ؎

دشت تسخیر ہو کر، گرد خرام دُلدُل	نعل در آتشِ ہر ذرہ ہے تیغ کہسار

آنحضرت صلعم نے اس خچری کو حضرت علیؓ کو عطا فرمادیا تھا اس لیے حضرت علیؓ کو "شہ دُلدُل سوار" کہا جاتا ہے۔ غالب ؎

دو عالم ناز، یک صید شہ دُلدُل سوار

یاں خط پرکارِ ہستی حلقۂ فتراک ہے

ہُدہُد و سلیمان

حضرت سلیمان کے ساتھ اکثر ہدہد (کھٹ بڑھئی) کا نام بھی آتا ہے۔ حضرت سلیمان کو اللہ تعالی نے چرند و پرند کی بولیاں سمجھنے کا علم بھی عطا کیا تھا۔ آپ کے دربار میں

انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق بھی حاضر رہتی تھی اور ہر ایک کے سپرد ایک مخصوص کام تھا۔ دربار سلیمان میں ہُدہُد کے سپرد پانی کی تلاش کا کام تھا۔ وہ لشکر سلیمانی کے آگے آگے اُڑ کر یہ کام انجام دیتا تھا۔ ایک روز حضرت سلیمان نے اپنے دربار میں ہُدہُد کو غائب پایا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے "وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ٥ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ٥ (نمل ۔۲۷۔۲۰) یعنی اور سلیمان نے پرندوں کی حاضری لی تو فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہو گیا ہے میں اس کو سخت عذاب دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف حجت میرے سامنے پیش کرے۔

ہُدہُد نے اپنی غیر حاضری کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ملک سبا میں ایک عورت کی بڑی بادشاہت دیکھ کر آیا ہے تو حضرت سلیمان کو اس کی بات کا یقین نہ آیا اور انہوں نے ملکہ سبا (بلقیس) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو لے جانے والا بھی ہُدہُد ہی تھا۔ بلقیس نے جب اس خط کو پڑھا تو اپنے تین سو وزیروں اور مصاحبوں کی صلاح لے کر مسلمان ہو گئی۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے، اسی نسبت سے ہُدہُد کو "قاصد سلیمان" اور "پیک سلیمان" بھی کہا جاتا ہے۔ غالبؔ ؎

تیرے کوچے میں ہے مشاطۂ واماندگی، قاصد	پیر پرواز زلف باز ہے، ہُدہُد کے شانے میں

ہُدہُد سے متعلق بہت سی روایتیں اور کہانیاں مشہور ہیں۔ مثلاً مصر میں اس کو "ابن سلیمان" کہا جاتا ہے۔ عربی میں بھی اس کی کئی کنیتیں مشہور ہیں جیسے ابوالسجادہ وغیرہ۔ یہ مشہور ہے کہ ایک بار ہُدہُد نے حضرت سلیمان اور اُن کے سارے لشکر کی دعوت کی تھی۔ جب سارے مہمان آ گئے تو ہُدہُد نے ایک مردہ ٹڈی سمندر میں ڈال کر کہا "اب خوب کھاؤ اللہ کے رسول! اگر گوشت کم پڑ جائے تو شوربا بہت ہے، کم نہ پڑے گا۔" ہُدہُد کے اس تمسخر پر حضرت سلیمان اور ان کے مصاحبین کو اتنی ہنسی آئی کہ ایک سال تک ہنستے رہے تھے۔ غالبؔ ؎

غرورِ دست رَدِ شانہ توڑا فرق ہدہد پر	سلیمانی ہے ننگِ بے دماغانِ خود آرائی

شانہ شکستن فارسی کا مشہور کنایہ ہے جو ہراساں اور خائف کرنے کے لیے آتا ہے

خواجہ نظامی فرماتے ہیں ۔

شغبہائے آئینہ پیل مست	ہمی شانہ برپشت پیلاں شکست

دست رد بجائے انگشت رد کے بھی مستعمل ہے جیسے شانی تعلو فرماتے ہیں ۔

شعر شانیؔ آتش است از پہر آں ناز و حسود	دستِ رد بر نظم و حرف آبدار من نہد

ہفتاد و دُو ملّت

مرزا غالب کا شعر ہے ۔

ہے اسیر ستم کشمکش دام وفا

دل وارستہ ہفتاد و دوملت بیزار

ہفتاد و دوملّت سے مراد اسلام کے بہتر فرقے ہیں۔ ان میں سے ہر فرقہ خود کو ناجی اور باقی کو ناری سمجھتا ہے۔ ویسے سب خدا کے بندے اور مغفرت کے امیدوار ہیں۔

صاحب بہارستان عجم نے مصطلحات کے حوالہ سے لکھا ہے در حقیقت اصل فرقے سات ہیں یعنی جبریؔ۔ قدریؔ۔ مشبہؔ۔ منزہؔ۔ سنیؔ۔ شیعیؔ اور خارجیؔ

حضرت شیخ فرماتے ہیں ۔

کتاب ہفت ملت ماندہ بر طاق فراموشی	مرا سیپارۂ دل بسکہ نیکوفال می باشد

ہُما

مرزا غالب کا شعر ہے ۔

جو ہُوا غرقۂ مئے، بختِ رسا رکھتا ہے	سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہُما ایک مشہور افسانوی پرند کا نام ہے جو صرف ہڈیاں کھاتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس کو تمام پرندوں سے افضل قرار دیا ہے۔ مشہور ہے کہ جس شخص کے سر پر ہما کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ظل ہما اور بال ہما کی تلمیحات نیک بختی کے معنی میں مستعمل ہیں۔ شاہان ایران اس پرند کو مبارک و مسعود سمجھ کر اپنے جھنڈے پر اس کی خیالی تصویر بناتے

تھے۔ زمانۂ قدیم میں اس کی پرستش بھی کی جاتی تھی۔ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہما کو مارنے والا آدمی چالیس دن کے اندر مر جاتا ہے۔ مغلیہ خاندان کے مشہور بادشاہ ہمایوں بھی ہما یعنی پرند اور ''یوں'' کلمۂ نسبت سے مرکب ہے۔ اس کے معنی مبارک و مسعود، کامیاب اور بابرکت کے ہیں۔ کچھ لوگ اس پرند کو ہی عنقا کہتے ہیں۔

ہنوز دلّی دُور ہے

مرزا غالب کا شعر ہے

کیجئے جوں اشک اور قطرہ زنی	اے اسدؔ ہے ہنوز دلّی دور

اس تلمیحی ضرب المثل کو ایسے موقع پر بولتے ہیں جب حصول مطلب میں دیر ہو یا بہت سا کام کرنا باقی رہ گیا ہو۔ یہ مقولہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا ہے کیونکہ آپ نے ایک بار سلطان غیاث الدین تغلق کے قاصد کو یہ جواب دیا تھا کہ ''ہنوز دلّی دور است۔'' اس کو صرف ''دلّی دور ہے'' بھی بولتے ہیں۔

صاحبِ فرہنگ آصفیہ نے تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق بظاہر تو عقیدت رکھتا تھا مگر بباطن حضرت محبوب الٰہی سے بے حد کاوش اور عناد رکھتا تھا کیونکہ آپ بار بار استدعا کے باوجود کبھی اس کے دربار میں تشریف نہ لے گئے۔ ایک بار جب وہ بنگال کی مہم سے واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے ایک قاصد کے ذریعہ حضرت محبوب الٰہی کو یہ پیغام بھیجا ''آپ میرے دہلی پہنچنے سے قبل ہی دہلی سے چلے جائیں اور اپنا مسکن غیاث پور نہ بنائیں۔'' حضرت محبوب الٰہی نے اس گستاخانہ پیغام کا صرف اتنا جواب دیا تھا کہ ''بابا ہنوز دلّی دور است'' چنانچہ پھر بادشاہ کو دلّی پہنچنا نصیب نہ ہوا اور وہ قصر تغلق میں دب کر ہی مر گیا۔ یہ قصر اس کے بیٹے نے باپ کے ٹھہرنے کے لیے افغان پور میں تعمیر کرایا تھا۔ اس وقت سے یہ مثل ہندوستان میں مروّج ہو گئی ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ عجائب الاسفار میں لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق کا بیٹا جونا خاں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف سلطان المشائخ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔

ایک دن حضرت نے عالم وجد میں اس کی عقیدت مندی کو دیکھتے ہوئے فرمایا" جا ہم نے تجھے سلطنت بخشی۔" جب یہ خبر غیاث الدین کو پہنچی تو اسے بہت ناگوار گزرا اور اس نے بنگال سے ہی یہ پیغام بھیجا "یا شیخ آنجا باشد یا من۔" سلطان المشائخ نے اس کو سن کر مذکورہ بالا جواب دیا اور بنگال سے لوٹتے ہوئے ۷۲۵ھ میں دہلی پہنچنے سے قبل ہی بادشاہ نے وفات پائی۔ اسی سن میں حضرت محبوب الٰہی نے بھی وصال فرمایا تھا۔

اس ضرب المثل کا ایک قصہ صاحب نجم الامثال نے بھی لکھا ہے۔ انہوں نے جہانگیر کے قاصد کے ایک ہی دن میں لاہور دہلی پہنچنے اور ایک بوڑھی عورت کی زبان سے "توج دلّی دور" کو "ہنوز دلّی دور" سمجھ کر مرنے کا لکھا ہے جو محض قیاسی اور غلط ہے۔

ہولی

مرزا غالبؔ فرماتے ہیں ؎

سو اس اکیس دن میں ہولی کی	جابجا مجلسیں ہوئی رنگیں
شہر میں کو بہ کو، عبیر و گلال	باغ میں سُو بہ سُو گل و نسریں

ہولی، ہندوستان کا مشہور موسمی تہوار ہے جو ہر سال پھاگن کے مہینہ میں منایا جاتا ہے اسی لیے اس کو "پھاگ" بھی کہتے ہیں۔ اس تہوار میں ایک دوسرے پر عبیر و گلال اور رنگ پھینک کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے کیونکہ اس دن ہزاروں سال پہلے لوگوں نے ہرناکش سے نجات پائی تھی۔ اس کی بیٹی ہولکا جل کر ہلاک ہو گئی تھی اور خدا پرست بیٹا پرہلاد اس آگ میں محفوظ رہا تھا جو اس کو ختم کرنے کے لیے جلائی گئی تھی۔ ہرناکش نے خدا ہونے کا دعوا کیا تھا اور اس کی مملکت میں خدائے واحد کا نام تک لینا جرم تھا۔ اس کا بیٹا پرہلاد اپنے باپ کے دعوائے ربوبیت کا قائل نہ تھا اس لیے اس کو طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں۔ آخر میں جب اس کو جلانے کے لیے آگ کا الاؤ طیار کیا گیا تو وہ آگ پرہلاد کے لیے گلزار ہو گئی۔ اسی وقت سے ہندوستان میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

مطبوعات

غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی 110013

(1)	دیوانِ غالب (ہندی)		75/-
(2)	دیوان غالب عام ایڈیشن		60/-
(3)	غالب شناس مالک رام	گیان چند جین	90/-
(4)	اردو غزل کے نشتر قلی قطب شاہ تا میر تقی میر	پروفیسر مسعود حسین	60/-
(5)	اقبال کی منتخب نظمیں غزلیں تنقیدی مطالعہ	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	150/-
(6)	تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
(7)	فیضان غالب	عرش ملسیانی	22/-
(8)	غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
(9)	تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
(10)	انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
(11)	مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
(12)	ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
(13)	نوائے سروش (انگریزی)		40/-
(14)	اقبال / مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
(15)	جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
(16)	رقص شرر	ان میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
(17)	اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمٰن فاروقی	55/-
(18)	غالب کی نئی سوانح عمری (خطوط کی روشنی میں)	ڈاکٹر تنویر احمد	200/-
(19)	تلمیحات غالب	محمود نیازی	75/-